الرسالہ
Al-Risala

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

خدایا مجھے چیزوں کو ویسا ہی دکھا
جیسا کہ وہ فی الواقع ہیں
نہ کہ ویسا جیسا کہ
میں انھیں دیکھنا چاہتا ہوں۔

اکتوبر ۱۹۹۳ شمارہ ۲۰۳

Rs. 6

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

اکتوبر ۱۹۹۳، شمارہ ۲۰۳

طمع کا نقصان	۴	ایک ملاقات	۱۱
اپنے اوپر فتح	۵	اعراض کا فائدہ	۱۲
انتظار کیجئے	۶	اعزاز یا ذمہ داری	۱۳
دینی فہم	۸	اسلام کا استحصال	۱۴
فطرت کا قانون	۹	تاریخ کا سبق	۱۵
صفحۂ عبرت	۱۰	شانتی یاترا	۱۶

AL-RISALA (Urdu) Monthly
1, Nizamuddin West Market, New Delhi -110 013, Tel. 4611128, 4697333
Fax: 91-11-4697333
Single Copy Rs. 6 ☐ Annual Subscription Rs. 70/$25 (Air-mail)

طمع کا نقصان

عن سفیان، انّ عمر بن الخطاب رضی اللّٰہ عنہ قال لکعب۔ مَن اربابُ العلم۔ قال الذین یعملون بما یعلمون۔ قال فما اخرجَ العلمَ مِن قلوب العلماء۔ قال الطمع۔

(مشکاۃ المصابیح ۱/۸۸)

سفیان کہتے ہیں کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت کعب سے پوچھا کہ علم والے کون ہیں۔ انھوں نے کہا کہ وہ لوگ جو اس پر عمل کرتے ہیں جس کو وہ جانتے ہیں۔ انھوں نے پوچھا کہ وہ کیا چیز ہے جو علماء کے دلوں سے علم کو نکال دیتی ہے۔ جواب دیا کہ طمع۔

عام آدمی کی طمع صرف پیسہ کی حد تک ہوتی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ پیسہ حاصل کرے تاکہ وہ اپنی ضرورتوں کو پورا کرے اور اپنے لیے ایک فراغت کی زندگی حاصل کر سکے۔

یہ طمع کی ابتدائی صورت ہے۔ مگر طمع کا جذبہ اتنا طاقت ور جذبہ ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔ بظاہر پائے ہوئے لوگوں میں بھی وہ اسی طاقت کے ساتھ موجود رہتا ہے جتنا کہ نہ پائے ہوئے لوگوں میں۔ جس آدمی کو ضرورت کے بقدر مل جائے وہ عیش کے بقدر حاصل کرنے کی لالچ میں پھنس جاتا ہے۔ جس آدمی کو تھوڑا اقتدار مل جائے وہ زیادہ اقتدار کی ہوس میں پڑ جاتا ہے۔ جو آدمی ایک حلقہ میں مشہور ہو جائے وہ تمام حلقوں میں بلکہ ساری دنیا میں شہرت و مقبولیت حاصل کرنے کا خواب دیکھنے لگتا ہے۔ جس آدمی کے گرد ہزاروں کی بھیڑ اکٹھا ہو جائے وہ چاہنے لگتا ہے کہ کروروں کی بھیڑ اس کے گرد دکھائی دینے لگے۔ وغیرہ۔

اس طمع کی خاطر آدمی یہ کرتا ہے کہ وہ علم رکھنے کے باوجود جہالت کی بات کرتا ہے۔ اس کا دل ایک حقیقت کو مان رہا ہوتا ہے مگر وہ لوگوں کے سامنے اس کا اعتراف نہیں کرتا۔ وہ اصول کی زبان بولنے کے بجائے مصلحت کی زبان بولتا ہے۔ وہ اندر سے کچھ ہوتا ہے مگر اوپری طور پر وہ کسی اور شکل میں اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ سب وہ اس لیے کرتا ہے تاکہ اس کی امیج خراب نہ ہو۔ تاکہ اس کا مفاد خطرہ میں نہ پڑے، تاکہ عوام کے درمیان اس کی مقبولیت میں کمی نہ ہو، تاکہ لوگوں کے درمیان اس کی اعلیٰ پوزیشن برقرار رہے۔ وہ باہر کے اعتبار سے بڑھتا ہے مگر وہ اندر کے اعتبار سے ختم ہو جاتا ہے۔

اپنے اوپر فتح

ایڈمنڈ ہلیری (Edmud Hillary) ۲ جولائی ۱۹۱۹ کو نیوزی لینڈ کے شہر آکلینڈ میں پیدا ہوا۔ اس کو پہاڑوں پر چڑھنے کا شوق تھا۔ پہلے وہ اپنے ملک کے پہاڑوں پر چڑھائی کیا کرتا تھا۔ اس نے پہلی بار ۱۹۵۱ میں ایک ٹیم کے ساتھ ہمالیہ کی چوٹی ایورسٹ پر چڑھنے کی کوشش کی جو ۲۸۰۲۹ فیٹ اونچی ہے۔ پہلی بار اس کو کامیابی نہیں ہوئی۔ دوسری بار وہ ۱۹۵۳ میں ایک برٹش ٹیم کے ساتھ ایورسٹ پر چڑھائی کے لیے روانہ ہوا۔ اس بار اس نے ایک نیپالی تنزنگ نارگے کو بطور رہنما ساتھ لیا۔ ۲۹ مئی ۱۹۵۳ کو وہ ایورسٹ کی بلندی پر پہنچ گیا، وہ پہلا انسان تھا جس نے دنیا کی سب سے بلند چوٹی پر اپنا قدم رکھا۔ چنانچہ فوراً ہی وہ ساری دنیا میں مشہور ہو گیا۔ برطانی حکومت نے ۱۶ جولائی کو اسے سر کا خطاب دیا۔ اس نے اپنی پہاڑی مہم پر ایک کتاب لکھی جو ۱۹۵۵ میں ہائی ایڈونچر (High Adventure) کے نام سے شائع ہوئی۔

سر ایڈمنڈ ہلیری نے اپنی کتاب میں جو باتیں لکھی ہیں ان میں سے ایک سبق کی بات یہ ہے کہ ہم پہاڑ کو فتح نہیں کرتے ہیں بلکہ ہم خود اپنے آپ کو فتح کرتے ہیں :

It is not the mountain we conquer but ourselves.

یہ ایک سادہ سی بات ہے مگر وہ بے حد اہم بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر فتح دراصل اپنے آپ پر فتح پانے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ہر فتح سب سے پہلے یہ چاہتی ہے کہ اس کے لیے ضروری جد وجہد کی جائے۔ گویا کہ آدمی کو سب سے پہلے اپنے آپ کو جد وجہد کا اہل ثابت کرنا پڑتا ہے، اس کے بعد ہی اس دنیا میں وہ اس کا اہل قرار پاتا ہے کہ اس کو فتح و کامیابی کا مقام عطا کیا جائے۔

خواہ پہاڑ پر چڑھنا ہو یا اور کوئی کامیابی حاصل کرنا ہو، آدمی کو سب سے پہلے محنت اور مشقت کے امتحان میں پاس ہونا پڑتا ہے۔ اس کو یہ ثبوت دینا پڑتا ہے کہ وہ صبر اور برداشت کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جس دن آدمی اپنے اندر ضروری اہلیت کا ثبوت دے دیتا ہے اس کے اگلے دن دنیا دیکھتی ہے کہ وہ کامیابی کی بلند چوٹی پر فاتحانہ کھڑا ہوا ہے۔

انتظار کیجئے

نومبر ۱۹۹۱ میں میرا ایک سفر بمبئی کے لیے ہوا تھا۔ وہاں میری ملاقات حاجی اکبر خان صاحب سے ہوئی۔ وہ بمبئی کے پرانے تاجر ہیں۔ انھوں نے ایک نیا آئٹم تیار کرایا اور اس میں اپنی بہت بڑی رقم لگادی۔ یہ آئٹم خلاف اندازہ مارکٹ میں نکل نہ سکا۔ حاجی صاحب پر اس نقصان کا بہت برا اثر پڑا۔ ان کا بلڈ پریشر بڑھ گیا۔ ان کو ذیابیطس کی شکایت ہوگئی۔ وغیرہ

حاجی صاحب کی رہائش گاہ پر ان سے میری ملاقات ہوئی۔ میں ان کی باتیں سنتا رہا اور دل کے اندر ان کے لیے دعا کرتا رہا، آخر میں جب روانگی کا وقت آیا تو میں نے ایک کاغذ لیا۔ اس پر ایک جملہ لکھا۔ اور اس کو بند لفافہ میں دیتے ہوئے ان سے کہا کہ اس کو میرے چلے جانے کے بعد کھول کر پڑھ لیں۔ وہ جملہ یہ تھا: آپ اپنے معاملہ کو غم کے خانہ میں ڈالنے کے بجائے انتظار کے خانہ میں ڈال دیجئے۔

اس واقعہ کے ڈیڑھ سال بعد ۸ جون ۱۹۹۳ کی ڈاک سے حاجی اکبر خان صاحب کا ایک خط مجھے ملا۔ اس خط کا مضمون یہ تھا:

"۹ نومبر ۱۹۹۱ کے روز آپ میرے غریب خانہ پر تشریف فرما تھے، اور میری روداد غم سن کر مجھے یہ نسخہ کیمیا عطا کر گئے تھے۔ "آپ اپنے معاملہ کو غم کے خانہ میں ڈالنے کے بجائے انتظار کے خانہ میں ڈال دیجئے۔"

یقین کیجئے، آپ کے اس جملہ کا مجھ پر حیرت انگیز اثر ہوا۔ نفسیاتی طور پر صبر کی بلندیوں کو چھونے کی کوشش میں، میں اپنے غم کو کافی ہلکا محسوس کرنے لگا۔ یہاں تک کہ آج جب جون ۱۹۹۳ کا الرسالہ میرے سامنے ہے اور سفرنامہ کے تحت اس واقعہ کو ڈیڑھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے، الحمد للہ، اسی "صبر" یعنی انتظار کے خانہ میں ڈالنے والے عمل کی وجہ سے اس نقصان کی کافی تلافی ہو چکی ہے۔ حالات نے خوش گوار کروٹ لی ہے، اور قوی امید ہے ۱۹۹۱ میں نظر آنے والا نقصان ۱۹۹۲ میں انشاء اللہ بھرپور منافع کی صورت میں اجاگر ہوگا۔ یہ ایک درس عظیم ہے کہ دنیا کے معاملہ میں صبر کا جب یہ صلہ ہے تو آخرت کے معاملہ میں صبر کا کس درجہ کا صلہ ہوگا۔ (اکبر خاں، مجگاؤں، بمبئی ۱۰)

انتظار ہر زخم کا مرہم ہے۔ انتظار محض انتظار نہیں، وہ خود ایک تدبیر ہے۔ مسئلہ پیش آنے پر آدمی اگر بے صبر نہ ہو، وہ صبر کرتے ہوئے انتظار کی پالیسی اختیار کرلے تو بہت جلد وہ محسوس کرے گا کہ انتظار اس کے مسئلہ کا حل بن گیا ہے۔ انتظار نے اس کام کو زیادہ بہتر طور پر انجام دے دیا ہے جس کو وہ خود انجام نہیں دے سکتا تھا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دنیا میں ہمہ گیر طور پر فطرت کا قانون اصلاح رائج ہے۔ یہاں ہر زخم کے اندمال کا انتظام ہے۔ یہاں مسئلہ پیش آتے ہی فطرت کی طاقتیں سرگرم ہو جاتی ہیں کہ اس کا قریب ترین حل نکال سکیں۔ جو چیز انسان کے لیے انتظار ہے، وہ فطرت کے نظام میں مداخلت نہ کرکے اسے یہ موقع دینا ہے کہ وہ تلافی مافات کے عمل کو بسہولت اپنے آخری مرحلہ تک پہنچا سکے۔

ایک آدمی رات کے اندھیرے میں اس طرح پھنس جائے کہ اس کے پاس روشنی کا کوئی سامان موجود نہ ہو تو اس کو سادہ طور پر صرف انتظار کے اصول کو اپنا لینا چاہیے۔ اگر وہ ایسا کرے تو وہ دیکھے گا کہ ایک مدت گزرنے کے بعد صبح کی روشنی اپنے آپ نمودار ہوگئی ہے تاکہ اس کی راہوں کو روشن کرکے اس کے لیے منزل کی طرف سفر کو آسان بنا دے۔

خود صاحب معاملہ کی نسبت سے بھی انتظار محض انتظار نہیں۔ وہ اپنی ذات میں ایک تدبیر ہے۔ کیوں کہ انتظار نہ کرنے والے شخص کا ذہن بیتے ہوئے واقعہ میں اٹکا رہتا ہے، جب کہ انتظار کرنے والے کا ذہن نئے حالات اور نئے امکانات کے دائرہ میں کام کرنے لگتا ہے۔ انتظار نہ کرنے والا اگر غم اور افسوس میں جیتا ہے تو انتظار کرنے والا مایوسی کے اندھیرے سے نکل کر امید کی روشنی میں چلنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

انتظار بے عملی نہیں، انتظار خود ایک عمل ہے۔ انتظار کا مطلب ٹھہرنا نہیں ہے۔ انتظار دراصل اس بات کی ضمانت ہے کہ آدمی ماضی سے اپنی نظریں ہٹا کر مستقبل کی طرف چل پڑا۔ اس دنیا میں ہر کھونے کے بعد پانا مقدر کر دیا گیا ہے۔ اس لیے اس دنیا میں انتظار حقیقۃً یہ معنی رکھتا ہے کہ آدمی محرومی کو بھلا کر یافت کو اپنا مرکز توجہ بنا لے۔

انتظار نہ کرنا ہمیشہ آدمی کو نقصان پہنچاتا ہے۔ انتظار کرنا ہمیشہ آدمی کے لیے فائدہ کا سبب بنتا ہے۔ یہ ایک ایسا کلیہ ہے جس میں کوئی استثناء نہیں۔

دینی فہم

قرآن میں ہے کہ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو..... اور چور مرد اور چور عورت دونوں کے ہاتھوں کو تم کاٹ دو۔ یہ ان کی کمائی کا بدلہ ہے اور اللہ کی طرف سے دونوں کے لیے عبرت ناک سزا۔ اور اللہ عزیز و حکیم ہے (المائدہ ۳۸)

ان الفاظ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر مسلمان کو یہ حق ہے کہ وہ جس کسی کو بھی چوری کرتا ہوا پائے اس کو پکڑ کر اس کا ہاتھ کاٹ دے۔ مگر اس آیت کا یہ مطلب نہیں۔ اس طرح کی آیات میں اہل ایمان سے مراد وہ اہل ایمان ہیں جو باقاعدہ طور پر حکومت و اقتدار کے مالک ہوں۔ جب بھی چوری یا اور کوئی قابل سزا جرم واقعہ ہو تو حکومت کے تحت قائم شدہ عدالتی نظام میں مجرم پر مقدمہ چلایا جائے گا اور باقاعدہ قانونی کارروائی کے بعد اس کا ہاتھ کاٹنا یا اور کوئی سزا دینا جائز ہوگا :

وقد علم من قرع سمعه هذا الخطاب	اہل علم میں سے جو کوئی اس حکم کو سنتا ہے وہ
من (اهل العلم ان المخاطبين بذلك	جان لیتا ہے کہ اس کے مخاطب حکام ہیں نہ کہ
هم الائمة دون عامة الناس۔ فكان	عام لوگ۔ پس یہاں تقدیر کلام اس طرح ہے کہ
تقديره فليقطع الائمة والحكام	ائمہ اور حکام کو چاہیے کہ وہ ان دونوں کے ہاتھ
(يديهما وليجلدهما الائمة والحكام۔	کاٹ دیں اور وہ ان دونوں کو کوڑے ماریں۔

(ابوبکر الجصاص، احکام القرآن ۲/۲۸۳)

یہ ایک سادہ سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تفقہ فی الدین کیا چیز ہے۔ تفقہ سے یہ صلاحیت مراد ہے کہ آدمی ظاہری الفاظ سے گزر کر اس کی معنوی گہرائی کو سمجھ سکے۔ وہ سطور کے ساتھ بین السطور کو پڑھ سکے۔ وہ ظواہر سے آگے بڑھ کر حقائق کو دریافت کر سکے۔

اسی لیے کہا گیا ہے کہ یک من علم را دہ من عقل می باید۔ جن لوگوں کے پاس ایک من علم ہو مگر ان کے پاس دس من عقل نہ ہو وہ خود بھی بھٹکیں گے اور دوسروں کو بھی بھٹکانے کا ذریعہ بنیں گے۔

فطرت کا قانون

ما اصاب من مصیبة فی الارض ولا فی انفسکم الا فی کتاب من قبل ان نبرأها۔ ان ذلك علی الله یسیر۔ لکیلا تأسوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا بما آتاکم۔ والله لا یحب کل مختال فخور۔

(الحدید ۲۲-۲۴)

کوئی مصیبت نہ زمین میں آتی ہے اور نہ تمہاری جانوں میں، مگر وہ ایک کتاب میں لکھی ہوئی ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم ان کو پیدا کریں۔ بیشک یہ اللہ کے لیے آسان ہے، تاکہ تم غم نہ کرو اس پر جو تم سے کھویا گیا۔ اور نہ اس چیز پر فخر کرو جو اس نے تم کو دیا۔ اور اللہ اترانے والے فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔

قرآن کے ان الفاظ میں فطرت کا ایک قانون بتایا گیا ہے۔ فطرت کے اس قانون کو جو لوگ جان لیں، ان کے لیے چھینے جانے کا واقعہ بھی اتنا ہی بامعنی ہو جاتا ہے جتنا کہ حاصل ہونے کا واقعہ۔

یہ دنیا امتحان کی مصلحت کے تحت بنائی گئی ہے۔ یہاں ہر ایک کو آزادی ہے۔ یہاں ہر ایک کو موافق اور ناموافق حالات سے گزارا جاتا ہے، تاکہ ہر پہلو سے آدمی کی جانچ ہو، اور یہ معلوم ہو جائے کہ کس طرح کی صورت حال میں آدمی نے کس قسم کا ردعمل پیش کیا۔ اس نے کس موقع پر اپنے آپ کو کیسا ثابت کیا۔ حالات کا آتار چڑھاؤ فطرت کا ایک قانون ہے جو کبھی کسی کے لیے بدلتا نہیں۔

اس دنیا میں کھونے اور پانے، دونوں قسم کے تجربے پیش آئیں گے، انفرادی سطح پر بھی اور قومی سطح پر بھی۔ مگر نہ یہاں کا پانا کامیابی ہے اور نہ یہاں کا کھونا محرومی۔ بلکہ دونوں ہی امتحان کے لیے ہیں۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ کھونے کو محرومی سمجھ کر بددل نہ ہو جائے۔ اسی طرح اس کو چاہیے کہ وہ پانے کو اپنے لیے اعزاز سمجھ کر فخر و تکبر میں مبتلا نہ ہو۔

آدمی کو چاہیے کہ وہ دونوں حالتوں کا استقبال معتدل نفسیات کے ساتھ کرے۔ ظاہری کامیابی بھی اس کے لیے فکری غذا کا ذریعہ ہو، اور ظاہری ناکامی بھی اس کی روحانیت میں اضافہ کرے۔ کوئی بھی واقعہ اس کے ذہن کو اس طرح ڈسٹرب نہ کرے کہ وہ مثبت طور پر سوچنے کے قابل نہ رہے۔

صفحۂ عبرت

ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوۃ (۲۳ محرم ۱۴۱۳ھ، ۲۳ جولائی ۱۹۹۲ء) میں صفحہ ۱۷ پر ایک خبر کی سرخی یہ ہے : ۴۳ قبیلة تعتنق الاسلام فی الفلبین (فلپائن میں ۴۳ قبیلوں کا قبول اسلام)

اس خبر میں بتایا گیا ہے کہ جنوبی فلپائن کے علاقہ میندناو (Mindanao) کے ۴۳ بت پرست قبیلوں نے اپنے اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا ہے۔ اسلام قبول کرنے والے ان قبیلوا میں قبیلہ مانوید بھی ہے جو کہ کیدان وان میں رہتا ہے۔ کیدان وان ایک شہر ہے جو صوبہ کوتاباتو (Catabato) میں واقع ہے۔ ان میں ۲۳۰ وہ اشخاص ہیں جنھوں نے پہلے مسیحیت قبول کرلی تھی، مگر اب وہ سب اسلام میں داخل ہو گئے ہیں۔

یہ صرف ایک مہینہ میں پیش آنیوالا واقعہ ہے۔ اس سے پہلے پچھلے سالوں میں بھی وہاں کے لوگ برابر اسلام قبول کرتے رہے ہیں۔ عرب ملکوں میں کام کرنے والے فلپائن کے لوگوں کے بارہ میں اکثر یہ خبریں آتی رہتی ہیں کہ انھوں نے اسلام قبول کرلیا۔

ایک طرف دعوت کے اعتبار سے اسلام کی تسخیر کا یہ عالم ہے۔ دوسری طرف اسی فلپائن کے ایک علاقہ میں پچھلے ۳۰ سال سے "مورو لبریشن فرنٹ" کے نام سے مسلمان سیاسی آزادی کی تحریک چلا رہے ہیں۔ زبردست قربانیوں کے باوجود اب تک اس تحریک کا کوئی بھی مثبت فائدہ حاصل نہ ہو سکا۔ فلپائن کے اس علاقہ میں سات ملین مسلمان رہتے ہیں۔ تعلیم اور اقتصادیات کے اعتبار سے وہ بے حد پیچھے ہیں۔

ستمبر ۱۹۸۹ میں افریقہ کے ایک سفر میں میری ملاقات مورو لبریشن فرنٹ کے چیرمین مسٹر نور مسواری سے ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ اب تک تقریباً ۱۵۰ ہزار مسلمان اس جدوجہد میں اپنی جان دے چکے ہیں۔ اس کے باوجود دور دور تک بھی کہیں کوئی مستقبل نظر نہیں آتا۔ سیاست کے راستہ سے کچھ ملنے والا نہیں، مگر ساری دنیا میں لاکھوں مسلمان اس کے لیے اپنا جان و مال قربان کر رہے ہیں۔ دعوت کے راستہ میں، آج بھی "سرخ اونٹوں" کی دولت مل رہی ہے۔ مگر کسی کو اس کی راہ میں عمل کرنے کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔

ایک ملاقات

۲۹ نومبر ۱۹۹۲ کو دہلی میں ڈاکٹر محمد عالم (پیدائش ۱۹۳۵) سے ملاقات ہوئی۔ وہ اعظم گڑھ (چکیا) کے رہنے والے ہیں اور تبلیغی جماعت سے جڑے ہوئے ہیں۔

انھوں نے بتایا کہ گودھرا (گجرات) میں پہلا تبلیغی اجتماع ۱۹۷۸ میں ہوا۔ اس میں انھوں نے شرکت کی۔ واپسی میں وہ گونڈہ آئے۔ یہاں سے بس کے ذریعہ اجودھیا پہنچے۔ اجودھیا میں بس نے گھاگھرا ندی کے کنارے اتارا۔ یہاں سے پیدل چل کر اس کا لمبا پل پار کیا۔ پھر پیدل چلتے ہوئے اجودھیا شہر میں داخل ہوئے۔ اس وقت ان کو سخت پیاس لگی ہوئی تھی۔ سڑک پر ایک دکان کے سامنے کھڑے ہو کر وہ ادھر اُدھر دیکھنے لگے کہ کہیں کوئی مسلمان دکھائی دے تو اس سے ملیں۔ مگر اس وقت میلا تھا اور ہر طرف ہندو ہی ہندو دکھائی دے رہے تھے۔

وہ دکان کے سامنے کھڑے تھے کہ اندر سے ایک ہندو نوجوان جو کہ پنڈا تھا، باہر آیا۔ اس نے کہا کہ مولوی صاحب، آپ کو کس چیز کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر عالم صاحب نے کہا کہ اس وقت میری تین ضرورت ہے۔ مجھے استنجا کرنا ہے۔ مجھے پیاس لگ رہی ہے اس لیے پانی پینا ہے، اور پھر مجھے ظہر کی نماز پڑھنا ہے۔ اس نے کہا کہ میرے ساتھ آئیے۔ اس نے ڈاکٹر عالم کا بستر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ پھر پانی دے کر انھیں لے جا کر استنجا خانہ پہنچایا۔ وہ فارغ ہو چکے تو وہ ان کو اپنے منڈپ میں لے گیا۔ کمبل بچھا کر انھیں بٹھایا اور ان کو ٹھنڈا پانی اور ریوڑی پیش کیا۔ اور کہا کہ اس کو کھا کر پانی پیجئے۔ اس کے بعد اس نے وضو کا پانی دیا اور صاف کپڑا بچھا کر کہا کہ یہاں آپ نماز پڑھ لیں۔

ڈاکٹر عالم صاحب جب نماز پڑھ چکے تو نوجوان پنڈا نے کہا کہ اب آپ چاہیں تو یہاں آرام کریں۔ ڈاکٹر عالم صاحب نے کہا کہ نہیں، اب مجھے ریلوے اسٹیشن پہنچ کر اعظم گڑھ کی ٹرین پکڑنا ہے۔ اس کے بعد نوجوان پنڈا نے ڈاکٹر عالم صاحب کا بستر اٹھایا اور ان کو لے جا کر تانگہ اسٹینڈ تک پہنچایا۔ اور کہا کہ اب آپ تانگہ سے اسٹیشن جا سکتے ہیں۔

انسان کی سطح پر ہر آدمی ویسا ہی ہے جیسا کہ مذکورہ ہندو نوجوان۔ مگر جب آپ انسان کی سطح سے ہٹ جائیں تو دوسرا آدمی بھی انسان کی سطح سے ہٹ جائے گا۔

اعراض کا فائدہ

پونہ کے ایک سفر میں وہاں کے لوگوں نے بتایا کہ ۲۲ ستمبر ۱۹۹۱ کو پونہ میں گنیش چترتھی کا جلوس نکلنے والا تھا۔ اسی دن ۱۲ ربیع الاول کی تاریخ بھی تھی، اور اس کی نسبت سے مسلمان اپنا میلاد النبیؐ کا جلوس نکالنا چاہتے تھے۔ اگر دونوں جلوس ایک ہی دن نکلتا تو یقینی تھا کہ دونوں میں ٹکراؤ ہو اور فرقہ وارانہ فساد کی صورت پیدا ہو جائے۔ اور پھر جشن کا دن شہر کے لیے غم کا دن بن جائے۔

پونہ کی سیرت کمیٹی کی دانش مندی سے یہ خطرہ ٹل گیا۔ انھوں نے ایک اجتماع کر کے مشورہ کیا کہ ایسی حالت میں کیا کیا جائے۔ اتفاق رائے سے فیصلہ ہوا کہ ہم لوگ اس معاملہ میں اعراض کا طریقہ اختیار کریں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی تاریخ بدل دی۔ انھوں نے میلاد النبی کا جلوس چند دن کی تاخیر کے ساتھ ۲۷ ستمبر کو نکالا۔ اس طرح ہندو جلوس اور مسلمان جلوس دونوں پر امن طور پر دو الگ الگ تاریخوں میں نکلے اور کسی ٹکراؤ کی نوبت نہیں آئی۔

اس واقعہ پر شہر کے تمام لوگ بہت خوش ہوئے۔ اور مسلمانوں کی دانش مندی کو سراہا۔ خاص طور پر پولیس کے لوگوں نے بہت زیادہ خوشی کا اظہار کیا۔ اور مسلمانوں کے اس عمل کی تعریف کی۔ انھوں نے مسلمانوں سے مل کر ان کا شکریہ ادا کیا۔ فساد نہ ہونا پولیس کے لیے ایک ذاتی کارنامہ کی حیثیت رکھتا ہے، اور یقینی طور پر پولیس کے لوگ چاہتے ہیں کہ یہ کارنامہ ان کی فہرست اعمال میں لکھا جائے۔

پونہ کی سیرت کمیٹی نے جب تاریخ کی تبدیلی کا فیصلہ کیا تو اسی وقت انھوں نے اس کی خبر مراٹھی اخباروں میں شائع کرا دی۔ اس طرح پورے مہاراشٹر کے مسلمانوں کو اس کی اطلاع ہو گئی۔ چنانچہ دوسرے جن مقامات پر دونوں جلوس ایک ہی دن نکلنے والے تھے، وہاں بھی اسی طرح مسلمانوں نے اپنے جلوس کی تاریخ کو بدل دیا۔ اس کے نتیجہ میں پورا مہاراشٹر فساد کے نقصان سے بچ گیا۔

فرقہ وارانہ فساد سے بچنے کی سب سے زیادہ کارگر تدبیر یہی اعراض کا طریقہ ہے۔ جہاں بھی لوگوں نے اس تدبیر کو استعمال کیا ہے وہاں فساد نہیں ہوا۔ فساد کے بم کو ناکارہ کرنے کی یہی واحد تدبیر ہے۔ فساد ہمیشہ غصہ کے تحت ہوتا ہے نہ کہ سازش کے تحت۔

اعزاز یا ذمہ داری

وزیر اعظم نرسمہا راؤ نے حال میں مرکزی کیبنٹ میں اضافہ کیا ہے۔ جو نئے وزیر لیے گئے ہیں ان میں سے ایک ۲۹ سالہ خاتون سیلجا چودھری (Selja Chaudhary) ہیں۔ وہ حکومت ہند کی وزارت تعلیم میں اسٹیٹ منسٹر مقرر کی گئی ہیں۔ ایک انٹرویو میں انھوں نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ جب میں نے ٹیلی فون کے دوسری طرف سے کیبنٹ سکریٹری کی آواز سنی جس میں یہ خبر دی گئی تھی کہ مجھے وزارت کے عہدہ پر مقرر کیا گیا ہے تو مجھے یقین نہیں آیا کہ یہ صحیح ہے۔ بظاہر میں اچھل تو نہیں پڑی مگر واقعہ یہ ہے کہ مجھے اس خبر سے بے حد خوشی ہوئی :

I didn't believe it was true when I heard the Cabinet Secretary's voice on the other end of the line informing me of my new office. I did not exactly jump but I was really very happy.

The Pioneer, New Delhi, July 12, 1992, p. 5.

یہ ایک علامتی واقعہ ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ ہمارے حکمراں نصف صدی گزرنے کے بعد بھی ملک کو امن اور ترقی کا ملک نہ بنا سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آزادی کے بعد جن لوگوں کو اقتدار کا منصب ملا ان کی نظر منصب کے اعزاز پر چلی گئی نہ کہ منصب کی ذمہ داریوں پر۔ اور جن لوگوں کا یہ حال ہو وہ کبھی ملک میں ترقی اور خوش حالی کا دور نہیں لا سکتے۔ جن لوگوں کی نظر منصب کے اعزاز پر ہو وہ منصب کو صرف اپنی ترقی کا ذریعہ بنائیں گے۔ اپنی ذات کو نمایاں کرنے کے سوا کسی اور چیز سے انھیں کوئی حقیقی دل چسپی نہیں ہو سکتی۔ وہ اپنے ذاتی فائدہ کی خاطر پورے ملک کو قربان کر سکتے ہیں۔ وہ اپنی ذات کے لیے پوری قوم کا سودا کر سکتے ہیں۔

اس کے برعکس جس آدمی کی نظر منصب کی ذمہ داریوں پر ہو، وہ جب کسی منصب کو پاتا ہے تو وہ کانپ اٹھتا ہے۔ اس کے لیے منصب ایک ایسا بوجھ بن جاتا ہے جس کے نیچے اس کی شخصیت دب کر رہ جائے۔ اول الذکر اگر قہقہوں کے ساتھ منصب کا استقبال کرتا ہے تو ثانی الذکر غم کے آنسوؤں کے ساتھ۔ جو لوگ منصب کو ذمہ داری سمجھیں ان کے لیے منصب کو پانا اپنی زندگی کی ویرانی کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ مگر یہی وہ لوگ ہیں جو ملک کو ایک سرسبز و شاداب باغ میں تبدیل کرنے کا کارنامہ انجام دیتے ہیں۔

۱۳ الرسالہ اکتوبر ۱۹۹۲

اسلام کا استحصال

ٹائم میگزین (۱۵ فروری ۱۹۹۳) نے ہندستانی مسلمانوں کے بارہ میں ایک باتصویر رپورٹ چھاپی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کے ساتھ جو ظلم اور فساد ہو رہا ہے، اس کی وجہ مسلمانوں کے خلاف وہ مذہبی نفرت (religious hatred) ہے جو ہندوؤں کے دلوں میں پیدا ہو گئی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کے خلاف ہندو نفرت کی تاریخ دسویں صدی عیسوی تک جاتی ہے جب کہ مسلم حملہ آوروں نے برصغیر ہند کو لوٹنا اور ہندو مندروں کو تباہ کرنا شروع کیا :

Hindu hatred for Muslims dates back to the 10th century, when Muslim invaders first began looting the subcontinent and destroying Hindu temples (p. 25).

مسلم حملہ آوروں پر یہ الزام بہت عرصہ سے لگایا جا رہا ہے۔ مولانا شبلی نعمانی (۱۹۱۴-۱۸۵۷) نے اپنے اعلیٰ انشا پردازانہ اسلوب میں اس کا طاقت ور دفاع کیا۔ برٹش انڈیا میں ان کی یہ تحریریں بہت مقبول ہوئیں۔ اس کے بعد مسلمان لکھنے اور بولنے والوں کا یہی عام رجحان بن گیا۔ ہر ایک اسی طرح شبلی کے اسلوب میں مسلم بادشاہوں کا دفاع کرنے لگا۔

یہ اسلوب مسلمانوں کو خوش کرنے میں بہت کامیاب رہا۔ مگر ہندوؤں کے ذہن کو بدلنے میں وہ اتنا ہی ناکام ثابت ہوا۔ ہندوؤں کا ذہن برعکس طور پر شدید ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ اب بیسویں صدی کے آخر میں پہنچ کر مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کی تاریخی نفرت اپنی آخری انتہا پر پہنچ گئی ہے۔ یہ الٹا انجام بتاتا ہے کہ شبلی کا اسلوب مفید نہ تھا۔ کیوں کہ اس معاملہ میں اصل کام ہندو نفرت کو ختم کرنا ہے نہ کہ مسلمانوں کی واہ واحاصل کرنا۔

اب ضرورت ہے کہ مسلمان اس معاملہ میں اپنے پورے رویہ کو تبدیل کریں۔ ہمیں ان مسلم بادشاہوں کا دفاع نہیں کرنا ہے بلکہ ان کی غلطیوں کا اعتراف کرتے ہوئے ان سے برأت ظاہر کرنا ہے۔ ہمیں یہ کہنا ہے کہ اسلام بلاشبہہ ایک سچا مذہب ہے۔ مگر مسلمانوں کا معاملہ اس سے الگ ہے۔ موجودہ زمانہ میں بہت سے مسلمان ہیں جو اپنے ذاتی مقاصد کی تکمیل کے لیے اسلام کا استحصال کرتے ہیں، اسی طرح پہلے بھی ہوا۔ مگر ان مسلمانوں کی کارگزاریوں کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

۱۴ ارسال اکتوبر ۱۹۹۳

تاریخ کا سبق

سابق امریکی صدر جارج بش نے ۵ اکتوبر ۱۹۹۱ کو اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ ایک شخص خارجہ پالیسی اور فوجی معاملات کو اقتصادی ترقی اور اصلاح سے جدا نہیں کر سکتا۔ دنیا نے واضح طور پر دیکھ لیا ہے کہ بڑھی ہوئی ہتھیار بندی اور جارحیت عراق کے لیے کتنی زیادہ مہنگی پڑی۔ دنیا نے یہ بھی دیکھ لیا ہے کہ سیاسی اور فوجی طاقت پر بہت زیادہ توجہ دینا اور اقتصادیات کو نظر انداز کرنا سوویت یونین کے لیے کتنا زیادہ اور شاید مستقل طور پر نقصان کا باعث ثابت ہوا :

> One can not separate foreign policy and military issues from economic growth and reform. The world has seen only too clearly the immense costs of over-armed, aggressive states such as Iraq. It has also seen how excessive focus upon projecting politico-military power and neglecting the economy has badly, perpahs permanently damaged the USSR.

موجودہ دنیا میں کبھی کبھی ضرورت کے طور پر طاقت کو بھی استعمال کرنا پڑتا ہے۔ مگر طاقت کا استعمال صرف انتہائی ضرورت کے تحت وقتی طور پر کیا جا سکتا ہے۔ طاقت کو مستقل پالیسی بنانا کسی کے لیے بھی مفید نہیں، نہ فرد کے لیے اور نہ قوم کے لیے، نہ منی پاور کے لیے اور نہ سپر پاور کے لیے۔

کوئی بھی اتنا طاقت ور نہیں کہ وہ اقتصادی ترقی اور ہتھیاروں کی دوڑ کو بیک وقت جاری رکھ سکے۔ ہتھیار بندی میں زیادہ وسائل لگانا ہمیشہ اس قیمت پر ہوتا ہے کہ اقتصادی ترقی میں اسی کے بقدر کمی کرنی پڑے۔ ایسی پالیسی ہمیشہ مہلک ہوتی ہے۔ ماضی اور حال کی تاریخ میں اس کے عبرت ناک نمونے موجود ہیں۔

امن عمومی پالیسی کا عنوان ہے اور جنگ استثنائی اقدام کا عنوان۔ کسی بھی فرد یا قوم کے لیے صحیح ترین پالیسی یہی ہے کہ وہ امن اور حسن تدبیر کے ذریعہ دوسروں کے ساتھ اپنے معاملات درست کرے۔ جنگ یا ٹکراؤ کا طریقہ صرف شدید ترین ضرورت کے لیے اتفاقی طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔

شانتی یاترا

دسمبر ۱۹۹۲ کے نصف آخر میں ایک سفر پیش آیا۔ یہ "شانتی یاترا" کا سفر تھا۔ دہلی۔ بمبئی۔ پونہ۔ ناگپور۔ بمبئی۔ دہلی کے درمیان بہت سی جگہوں پر جانے کا اتفاق ہوا۔ اس سلسلہ میں مجموعی طور پر تقریباً چھ ہزار کیلو میٹر کا سفر طے کرنا پڑا۔ یہ میری زندگی میں اپنی نوعیت کا پہلا سفر تھا۔ ذیل میں اس کی مختصر روداد درج کی جاتی ہے۔

یہ سفر ایک ٹیم کی صورت میں تھا۔ میرے علاوہ اس میں جو لوگ شریک تھے ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں —— اچاریہ منی سوشیل کمار، سوامی چیدانند، شانتی لال موتھا، انا صاحب ہزارے، جسٹس چندر شیکھر دھرماکاری۔

اچاریہ منی سوشیل کمار ہندستان کی ایک غیر نزاعی شخصیت ہیں۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی امن کے پرچار میں لگا رکھی ہے۔ اجودھیا کے حادثہ نے انھیں بے چین کر دیا۔ نئی دہلی میں ان کے آشرم میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی ہر مذہب کے رہنماؤں کی میٹنگیں ہوئیں۔ آخر کار طے ہوا کہ امن کے فروغ کے لئے اس سلسلہ میں کچھ عملی قدم اٹھائے جائیں۔

اس سلسلہ کا آغاز ۱۴ دسمبر ۱۹۹۲ کو ٹی وی پروگرام سے ہوا۔ پہلے ڈیفنس کالونی (نئی دہلی) کے آشرم میں مختلف مذہبوں کے لوگ جمع ہوئے۔ ٹی وی کی ٹیم یہیں آگئی تھی۔ اس نے ہر ایک سے ایک ہی سوال کیا "موجودہ حالات میں آپ دیش کے لوگوں کو کیا سندیش دینا چاہیں گے"۔ ہر مذہب کے نمائندہ نے کہا کہ اس وقت سب سے زیادہ ضرورت یہ ہے کہ امن قائم ہو اور نفرت کا خاتمہ کیا جائے۔ میں نے بھی یہی بات اپنے انداز سے کہی۔

میں نے مزید کہا کہ جب کچھ لوگ مل کر رہیں، تو خواہ وہ ایک گھر میں ہوں یا ایک ملک میں، بہر حال ایسے مواقع آتے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے تکلیف پہنچتی ہے۔ اس لئے عملی طور پر امن اسی وقت قائم ہو سکتا ہے جب کہ اختلافی بات پیش آنے کے باوجود امن و محبت کا طریقہ اختیار کیا جائے۔

آج ہی ٹی وی پر دوسرا پروگرام پینل کی صورت میں تھا۔ اس میں اچاریہ سوشیل کمار،

بشپ گریگوریوز (Dr Paulos Mar Gregorios) اور راقم الحروف نے حصہ لیا۔ ہر ایک نے ریلیجن اینڈ پیس (مذہب اور امن) کے موضوع پر اپنے اپنے خیالات پیش کئے۔ میں نے کہا کہ مذہب بنیادی طور پر انسانی شخصیت کو پاک کرنے کا ایک روحانی سسٹم ہے۔ موجودہ زمانہ میں مذہبی زوال کی بنا پر لوگ باہر کی چیزوں پر زیادہ زور دینے لگے ہیں۔ اس لئے جھگڑا پیدا ہوتا ہے۔ اگر لوگوں میں سچی مذہبی اسپرٹ ہو تو وہ اندر کی صفات پر زیادہ زور دیں گے اور پھر جھگڑا اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔

ٹی وی کے ان پروگراموں پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک صاحب نے کہا کہ دوردرشن نے یہ بہت اچھا کیا کہ آپ لوگوں کو وقت کے حالات پر بولنے کا موقع دیا۔ اس سے پہلے دوردرشن والے ان موضوعات پر لیڈروں یا سیکولر لوگوں کو سامنے لاتے تھے۔ مگر مذہب اور انسانیت کے بارہ میں سیاسی لیڈروں یا سیکولر دانشوروں سے کہلوانے کا کوئی خاص عملی فائدہ نہیں۔ ان باتوں کو تو مذہبی لوگوں کی طرف سے سامنے آنا چاہئے۔ اس پروگرام کا لوگوں کے اوپر یقیناً اچھا اثر ہوگا۔

ٹیلی وژن کا اصول ابتدائی طور پر اگرچہ انیسویں صدی کے آخر میں دریافت ہو چکا تھا۔ مگر جدید ٹی وی سیٹوں کی تیاری اور ٹی وی کا باقاعدہ نظام دوسری عالمی جنگ کے بعد قائم ہو سکا۔ ٹی وی کو ایک طاقت ور میڈیا سمجھا جاتا ہے۔ مگر موجودہ زمانہ میں ہر چیز آخر کار ایک تجارتی انڈسٹری بن جاتی ہے۔ اور اس بنا پر ان کا استعمال زیادہ تر غیر مفید کاموں میں ہو رہا ہے۔

مثلاً دسمبر ۱۹۹۲ میں برصغیر کے فرقہ وارانہ فسادات کا سب سے بڑا سبب ٹی وی، خاص طور پر بی بی سی ہے۔ بی بی سی کے کارکن جدید ترین آلات سے لیس ہو کر ۶ دسمبر کو اجودھیا میں موجود تھے۔ انھوں نے مسجد پر ہندو انتہا پسندوں کی یلغار کا اور اس کو ڈھائے جانے کا مسلسل فوٹو لیا۔ اس تصویری رپورٹ کو پاکستان میں بڑے پیمانے پر ٹی وی پر دیکھا گیا۔ اس درمیان میں حکومت پاکستان نے مزید نادانی یہ کی کہ ۷ دسمبر کو یوم سیاہ منانے کا اعلان کر دیا۔ یوم سیاہ کے مظاہروں نے پاکستانی عوام کو اور زیادہ بھڑکا دیا۔ انھوں نے پاکستان میں ہندو مندروں پر بلڈوزر چلائے، کئی ہندوؤں کو مار کر درخت سے لٹکا دیا۔ وغیرہ۔ اس قسم کے مختلف سنسنی خیز مناظر دوبارہ بی بی سی نے ٹی وی پر دکھائے۔ ان مناظر کو دیکھ کر انڈیا کے ہندو بھڑک اٹھے۔ اس طرح ۸ دسمبر کو ہندستان کے مختلف

علاقوں میں فرقہ وارانہ فساد شروع ہوگیا۔

۱۵ دسمبر ۱۹۹۲ کی صبح کو ساڑھے چھ بجے گھر سے نکل کر ایئرپورٹ کے لئے روانہ ہوا۔ فضا میں ہر طرف اجالا پھیل چکا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ آج رات کو میں نے ایک اردو پرچہ میں ایک مضمون پڑھا تھا۔ اس کا عنوان تھا ــــ "ہر طرف اندھیرا" اس میں دکھایا گیا تھا کہ آج ہر جگہ کے مسلمان ظلم و زیادتی کا شکار ہو رہے ہیں۔ ملت کے افق پر ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا ہے۔

میں نے سوچا کہ اس زمین پر خدا مسلسل یہ کر رہا ہے کہ وہ ہر ۲۴ گھنٹہ کے اندر شام کو صبح میں تبدیل کرتا ہے۔ وہ ہر روز رات کی تاریکی کو ختم کر کے دن کا اجالا پھیلا رہا ہے۔ اس طرح خدا دکھا رہا ہے کہ اس دنیا میں مایوسی کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ یہاں ہر اندھیرے کے بعد اجالا ہے۔ ایسی حالت میں قرآن کے حاملین "اندھیرا ہی اندھیرا" کی فریاد کیوں کر رہے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ فکری اعتبار سے وہ اس حالت کو پہنچ گئے ہوں جس کو قرآن میں ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے: ان قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجورا (الفرقان ۳۰)

ہمارے امن مشن کو دہلی سے پونہ پہنچنا تھا۔ مگر رات کو معلوم ہوا کہ پونہ کی فلائٹ کینسل ہوگئی ہے۔ فوری طور پر رات ہی کو جہاز تبدیل کیا گیا اور یہ طے کیا گیا کہ دہلی سے بمبئی جائیں اور وہاں سے پونہ پہنچیں۔ چنانچہ ایئرپورٹ پر خلاف معمول سناٹا تھا۔ بڑی تعداد میں انڈین ایئرلائنز کے جہاز گراؤنڈ پر کھڑے ہوئے نظر آئے۔

انڈین ایئرلائنز کے پائلٹوں نے اسٹرائک کر رکھی ہے۔ ایئرپورٹ پر میں نے ایک صاحب سے پوچھا کہ اسٹرائک کا سبب کیا ہے۔ انھوں نے طنزیہ انداز میں کہا کہ ان پائلٹ لوگوں کو فی گھنٹہ بارہ سو روپیہ ملتا ہے۔ وہ سات ہزار روپیہ روز کماتے ہیں۔ اس کے علاوہ کھانا رہنا سب فری ہے۔ تب بھی وہ خوش نہیں۔ انھیں مہینہ میں دو لاکھ روپیہ چاہئے۔

انڈین ایئرلائنز کے پائلٹوں نے جب اسٹرائک کر دی تو سول اوی ایشن منسٹر نے فوراً متبادل انتظام کی تلاش شروع کر دی۔ پر مسرت تعجب کے ساتھ انھیں معلوم ہوا کہ روس کے ۵۰۰ ہوائی جہاز ازبکستان میں خالی پڑے ہوئے ہیں۔ انھوں نے روسی حکومت سے ربط قائم کیا اور آسان شرطوں پر چھ ہوائی جہاز فوری طور پر منگوا لئے۔ اس طرح ٹرنک روٹ (دہلی، بمبئی، کلکتہ، مدراس) کی

پروازیں بحال کریں۔

انڈین اکسپریس (۱۵ دسمبر ۱۹۹۲) میں صفحہ اول پر اس خبر کی سرخی کا عنوان تھا کہ اب روسی جہاز اسٹرائک زدہ انڈین ایئر لائنز کی مدد پر:

Now, Russian aircraft to the rescue of strike hit IA

میں نے سوچا کہ اگر مجھ کو اس خبر کی سرخی بنانا ہو تو میں لکھوں گا کہ ـــــ ہر کھوئی ہوئی چیز کا بدل اس دنیا میں موجود ہے۔

۱۵ دسمبر ۱۹۹۲ کو صبح ۸ بجے دہلی سے بمبئی کے لئے روانگی ہوئی۔ یہ ایک روسی ساخت کا جہاز ہے۔ اس کا تمام ٹکنیکل عملہ روسی ہے۔ صرف میزبان عملہ میں کچھ ہندستانی دکھائی دیتے ہیں۔ جہاز کی پرواز خوشگوار تھی۔

جہاز میں انڈین اکسپریس (۱۵ دسمبر) کا مطالعہ کیا۔ اس میں بھوپال کی ڈیٹ لائن کے ساتھ مسٹر این ڈی شرما کی ایک رپورٹ چھپی تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ بھوپال میں تبلیغی جماعت کا سالانہ اجتماع ۱۹۔ ۲۱ دسمبر کو ہونے والا تھا۔ توقع کے مطابق اس اجتماع میں دو لاکھ آدمی شریک ہوتے۔ مگر فسادات کی وجہ سے بھوپال میں ابھی تک کرفیو چل رہا ہے، اس لئے ریاستی انتظامیہ کو تشویش ہوئی۔ مدھیہ پردیش کی حکمراں پارٹی (بی جے پی) نے بدل کے طور پر یہ تجویز کیا کہ اجتماع کو مختصر طور پر غیر نمایاں انداز میں کیا جائے۔ اور تبلیغی جماعت کے لوگ راضی ہو گئے:

As an alternative, the ruling party leaders have requested the organisers to keep it a low-key affair and they have agreed (p. 12).

یہ نہایت صحیح فیصلہ ہے۔ اس طرح کے نازک مواقع پر اگر اس طرح ایڈجسٹمنٹ کا طریقہ اختیار کیا جائے تو بیشتر سماجی جھگڑے اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔ اسی مومنانہ مزاج کو حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ مومن کی مثال میدان میں اگی ہوئی گھاس کی مانند ہے۔ اِدھر کی ہوا چلی تو اُدھر جھک گیا اور اُدھر کی ہوا چلی تو اِدھر جھک گیا۔

جہاز میں انڈین ایئر لائنز کا فلائٹ میگزین سواگت کا شمارہ دسمبر ۱۹۹۲ مطالعہ کے لئے موجود تھا۔ اس کے ہندی سکشن میں ایک مضمون تھا جس کا عنوان تھا: گوپال نرائن پبلک لائبریری۔ یہ

لائبریری بھرت پورہ (بہار) میں واقع ہے۔ مضمون میں اس کا تفصیلی تعارف تھا۔ بتایا گیا تھا کہ اس میں بہت سے قدیم مخطوطات ہیں۔ ان میں سے کئی چیزوں کے فوٹو بھی دئے گئے تھے۔ ایک فوٹو سے معلوم ہوا کہ اس لائبریری میں بہت سے قدیم کتبات ہیں۔ ایک کتبہ میں یہ فارسی شعر تھا کہ بلند ہمت آسمان سے بھی اوپر اٹھ جاتا ہے اور آدمی ہمت کے ذریعہ فرشتہ سے آگے چلا جاتا ہے:

ہمت عالی زفلک بگذرد مرد بہ ہمت زملک بگذرد

صبح تقریباً ساڑھے نو بجے ہم بمبئی ایرپورٹ پر اتر گئے۔ لینڈنگ اتنی اسموتھ تھی کہ محسوس ہی نہیں ہوا کہ جہاز زمین پر اتر گیا ہے۔ بمبئی ایرپورٹ میں داخل ہوا تو وہی مانوس منظر تھا جو ہر ایرپورٹ پر دکھائی دیتا ہے۔ لوگ مخصوص گاڑی سنبھال کر اپنا اپنا سامان لینے کے لئے کنویر بیلٹ کی طرف دوڑ رہے تھے۔

ایرپورٹ سے ہم سب کو مسٹر رویندر کمار کی رہائش گاہ پہنچنا تھا۔ میں جس گاڑی میں تھا اس کو خود مسٹر رویندر کمار چلا رہے تھے۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ بمبئی کا ایک مسلمان میکانک جس کی عمر ۲۸ سال تھی۔ وہ اس فساد میں مارا گیا۔ بہت اچھا لڑکا تھا۔ مجھ سے بہت پریم تھا۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ بٹوارہ کے بعد دونوں فرقوں میں جو کڑواہٹ آگیا تھا وہ اب ختم ہو چکا تھا۔ نئی پیڑھی کو ان پرانی باتوں کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ لیکن اجودھیا کے جھگڑے کے بعد وہی دوری دوبارہ لوٹ آئی۔

یہ بہت صحیح ہے۔ دنیا میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دو آدمی یا دو گروہ میں کچھ شکایت کی باتیں ہو جاتی ہیں۔ مگر فطرت بہت جلد ان کو بھلا دیتی ہے۔ پہلے جھگڑے کے بعد اگر دوسرے جھگڑے سے بچنے کا اہتمام کیا جائے تو فطرت خود مرہم کا کام کرتی ہے۔ اور تعلقات نارمل حالت پر آجاتے ہیں۔

۶ دسمبر کے واقعہ کے بعد بمبئی کے بعض علاقوں میں شدید فساد ہوا۔ مگر یہاں کا سب سے زیادہ حساس علاقہ بھیونڈی فساد سے مکمل طور پر بچا رہا۔ سابقہ ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے یہ انتہائی انوکھا واقعہ تھا۔ چنانچہ بھیونڈی اینڈ منسٹریشن کی توجہ کا مرکز بن گیا۔

بمبئی کے ٹائمس آف انڈیا (۲۲ دسمبر ۱۹۹۲) میں ایک رپورٹ پڑھی۔ رپورٹر کا نام پرکاش چندر تھا، اور اس کا عنوان یہ تھا:

ACPs study Bhiwandi's technique of peace

اس میں بتایا گیا تھا کہ ۶ دسمبر کے بعد بھیونڈی کی حالت مثالی (exemplary) رہی۔ بھیونڈی ایک حساس ٹاؤن سمجھا جاتا تھا مگر یہاں بالکل کوئی فساد نہیں ہوا۔ چنانچہ ریاست مہاراشٹر کے مختلف مقامات سے انتظامیہ کے لوگ کیس اسٹڈی کے لئے بھیونڈی آئے۔ انھوں نے ہر جگہ معلومات حاصل کیں اور پانچ لاکھ روپیہ خرچ کرکے فلم ڈویژن نے ایک ڈاکومنٹری تیار کی۔

اس معجزاتی واقعہ کا سادہ سبب صرف ایک تھا۔ ۶ دسمبر کے بعد جب تناؤ پیدا ہوا تو دوسرے مقامات کے مسلمانوں نے "دفاع" کے اصول پر تیاریاں کیں۔ یہ دفاع عملاً فرقہ وارانہ فساد بن کر ظاہر ہوا۔ اس کے برعکس بھیونڈی کے مسلمانوں نے کئی محلہ کمیٹی بنائی۔ ان محلہ کمیٹیوں نے خود دفاع کرنے کے بجائے یہ کیا کہ جہاں کہیں کشیدگی کی صورت پیدا ہوئی فوراً وہاں پہنچ کر لوگوں کو ٹھنڈا کیا اور حسب ضرورت پولیس کو اطلاع دی۔ جب بھی انھوں نے ایسا کیا، پولیس صرف چند منٹ میں وہاں پہنچ گئی اور فوری کارروائی کرکے معاملہ کو ختم کر دیا۔ بم پر بم مارنا فساد پیدا کرتا ہے۔ بم کو ڈیفیوز کرنا فساد کو ابتدا ہی میں ختم کر دیتا ہے۔

بمبئی میں دو گھنٹہ قیام کے بعد بذریعہ کار پونہ کے لئے روانگی ہوئی۔ راستہ میں ایک جگہ نظر آیا کہ دو ٹرک سڑک کے ادھر اُدھر الٹے پڑے ہیں۔ معلوم ہوا کہ دونوں آمنے سامنے سے آرہے تھے غالباً ڈرائیور نشے میں تھا۔ اس نے گاڑی کو کنارے نہیں کیا۔ اور ٹکر ہوگئی۔ میں نے دیکھا تو ایک ٹرک کے پیچھے ہندی میں لکھا ہوا تھا: سندے ہو یا منڈے، روز کھاؤ انڈے۔

میں نے سوچا کہ ٹکر ہونے سے پہلے دونوں اس بھرم میں ہوں گے کہ میرا ٹرک میرا ٹرک ہے اس کو نقصان ہونے والا نہیں۔ اگر کچھ ہوا تو صرف دوسرے کا ہوگا۔ مگر جب ٹکر ہوئی تو دونوں کے دونوں تباہ ہوگئے۔ یہی عام جھگڑوں میں ہوتا ہے۔ دو فریق جب لڑتے ہیں تو پیشگی طور پر دونوں میں سے ہر ایک اپنے کو فاتح سمجھتا ہے۔ مگر لڑائی ہو جانے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ لڑائی دونوں کے حق میں تباہ کن تھی۔ دونوں میں سے کسی کو بھی اس سے فائدہ نہیں پہنچا۔

پونہ کی حد میں داخل ہوئے تو ریزرو بینک آف انڈیا کی بلڈنگ کے پاس ڈرائیور نے کسی وجہ سے گاڑی روکی۔ ہم تین آدمی (اچاریہ منی سوشیل کمار، سوامی چیدانند اور میں) تھے۔ ہم نے سوچا کہ یہاں سے اپنے میزبان کو ٹیلیفون کر دیں تاکہ انھیں معلوم ہو جائے کہ ہم پونہ میں پہنچ چکے ہیں۔

بینک کی بلڈنگ میں داخل ہوئے تو سوامی چیدانند نے گیٹ کے چوکیدار سے ٹیلی فون کی بابت پوچھا۔ اس نے بہت رکھائی کے ساتھ جواب دیا اور کہا کہ باہر پبلک ٹیلی فون لگا ہوا ہے۔ سوامی جی نے کہا کہ چوکیدار کو چھوڑئے۔ اندر چل کر دیکھتے ہیں۔ اتنے میں ایک شخص اسکوٹر سے وہاں آگیا۔ چوکیدار نے کہا کہ یہ ہمارے افسر ہیں اور ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

آنے والا ہم لوگوں کو دیکھ کر خود ہی اسکوٹر سے اتر گیا اور نرمی کے ساتھ بولا: میں آپ لوگوں کی کیا سیوا کر سکتا ہوں۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ ہم ٹیلیفون کرنا چاہتے ہیں تو فوراً اس نے کہا کہ آپ ہم کو اپنا نمبر دیدیجئے۔ میں خود ان کو ٹیلیفون کر کے بتا دیتا ہوں۔

یہی طریقہ ہر معاملہ میں درست ہے۔ نیچے کے لوگوں سے کبھی نہیں الجھنا چاہئے۔ ہمیشہ اوپر کے لوگوں سے ربط قائم کرنا چاہئے۔ کسی معاملہ کو حل کرنے کا یہی صحیح طریقہ ہے۔

۱۵ دسمبر کی شام کو ہم لوگ پونہ پہنچ گئے۔ رات یہاں گزاری گئی۔ پونہ ایک تاریخی شہر ہے۔ ۱۹۴۶ میں مہاتما گاندھی کچھ دنوں کے لئے پونہ میں ٹھہرے تھے۔ یہاں وہ ڈاکٹر ڈنشاہ مہتا کے زیر علاج تھے جو پونہ میں ایک کلینک (nature-cure clinic) چلا رہے تھے۔ مہاتما گاندھی کے سوانح نگار لوئی فشر (Louis Fischer) نے جولائی ۱۹۴۶ میں ان سے پونہ میں ملاقات کی۔ ملاقات کے دوران مہاتما گاندھی نے احمد آباد میں ہونے والے ہندو مسلم فساد کا ذکر کیا۔ مہاتما گاندھی نے کہا کہ اصل مشکل یہ ہے کہ ایک فریق چھرا مارنا اور قتل کرنا شروع کرتا ہے۔ اور پھر دوسرا فریق بھی ایسا ہی کرنے لگتا ہے۔ اگر دوسرا فریق اپنی اموات پر انتقامی کارروائی نہ کرے تو اس قسم کی چیز رک جائے گی:

The trouble is that one side begins stabbing and killing and then the other does likewise. If one side did not avenge its deaths the thing would stop (p. 424).

بظاہر یہ بہت مشکل ہے۔ مگر اس مسئلہ کا یہی واحد حل ہے، اس کے سوا اور کوئی اس مسئلہ کا حل نہیں۔ خواہ ہندستان ہو یا اور کوئی ملک ہو۔ جب بھی ایک فریق کی طرف سے اشتعال انگیزی یا تشدد کا کوئی واقعہ ہو تو دوسرے فریق کو برداشت کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے اس کو روکنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ غلطی کو انتقام کا مسئلہ بنانا غلطی کو بڑھاتا ہے۔ غلطی کو عفو و درگزر کا مسئلہ بنانا

غلطی کی آگ کو پہلے ہی مرحلہ میں بجھا دیتا ہے۔

پونہ میں عبدالصمد صاحب نے بمبئی کے دو اخبار دکھائے۔ ایک روزنامہ انقلاب تھا۔ اس کے شمارہ ۷ دسمبر ۱۹۹۲ میں بابری مسجد کے ڈھائے جانے پر مختلف اصحاب فکر کا ردعمل شائع کیا گیا تھا۔ جناب محمود ایوبی صاحب کا تاثر ان الفاظ میں نقل کیا گیا تھا :

"اس صورت حال کو پیدا کرنے میں یقیناً بی جے پی، وی ایچ پی، اور سنگھ پریوار کا ہاتھ ہے۔ لیکن ان کے ہاتھ مضبوط کرنے میں بابری مسجد کے نام پر سیاسی دکان چمکانے والے مسلم لیڈروں نے بھی کافی اہم رول انجام دیا ہے۔ مسلم لیڈر صاحبان جو آج صبر کی تلقین کر رہے ہیں، وہی باتیں جب الرسالہ والے مولانا وحید الدین خاں لکھتے اور کہتے تھے تو یہ کہا جاتا تھا کہ یہ بزدلی کی تعلیم دے رہے ہیں۔ ان ہی لیڈروں نے لوگوں کو مشتعل کیا اور ہمیں آج یہ دن دیکھنا پڑا۔ اچھی بات ہے کہ مسلمان صبر و ضبط کا ثبوت دے رہے ہیں۔"

ہفتہ وار بلٹز کے شمارہ ۱۲ دسمبر ۱۹۹۲ میں اس کے اڈیٹر جناب ہارون رشید ملیگ کا کا مضمون تھا۔ اس کا ایک پیرگراف یہ تھا :

"ہر چند کہ ملک میں فسادات کی لہر پھیلی ہوئی ہے، مسلمانوں نے بڑے صبر و تحمل اور ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لیا ہے۔ ورنہ تباہی و بربادی اور بھی زیادہ ہوتی۔ وہ نام نہاد مسلم لیڈر جو اشتعال انگیز بیان دینے میں بے مثال تھے، وہ بھی آج مولانا وحید الدین خاں کی بولی بول رہے ہیں (اور قوم کو صبر و ضبط سے کام لینے کی تلقین کر رہے ہیں)

پونہ میں لوگوں نے ایک ماروتی وین تیار کی تھی اس میں مجھ کو سفر کرنا تھا۔ میرے ساتھ پونہ کے چند مسلم احباب بھی شامل رہتے۔ اس طرح میں ایک علیحدہ گاڑی میں اپنے احباب کے درمیان سفر کرتا۔ ٹھہرنے کے مقام پر کسی مسلمان کے یہاں ٹھہرتا اور اجتماع کے وقت منچ پر جاکر تقریر کر دیتا اور پھر اپنے لوگوں میں واپس چلا آتا۔

یہ طریقہ مقصد سفر کے خلاف تھا۔ چنانچہ میں نے مذکورہ ماروتی وین پونہ میں روک دی۔ مسلم احباب کو بھی سفر سے منع کر دیا۔ میں نے طے کیا کہ مجھے شانتی یاترا کی بقیہ ٹیم کے ساتھ ہی اپنا پورا وقت گزارنا ہے۔ چلنا، اٹھنا اور بیٹھنا، سونا اور کھانا۔ غرض اس دوران دن اور رات انھیں لوگوں کے

ساتھ رہنا ہے۔ تاکہ ایک طرف شانتی یاترا کے پروگراموں میں مکمل شرکت ہو اور اسی کے ساتھ برادران وطن سے قریبی تعارف بھی ہو سکے۔ چنانچہ یہ پورا سفر اسی طرح گزرا۔

۱۶ دسمبر ۱۹۹۲ کی صبح کو پونہ سے شانتی یاترا شروع ہوئی۔ سامنے ایک جیپ میں شانتی گیت کی ریکارڈنگ چل رہی تھی۔ پیچھے ہماری کاروں کا قافلہ تھا۔ یہی صورت آخر تک جاری رہی۔ جیپ سے جو گیت نشر ہو رہا تھا وہ بڑا اثر انگیز تھا۔ گیت کا ایک شعر یہ تھا:

بدی بھلا کسی سے کرنہ سکو تو — برا کسی سے مت کرنا

ایک اور گیت کے کچھ شعر یہ تھے:

آشا کی دیپک جلنے دو — ٹوٹے ہوئے دل کو جڑنے دو
سب کو اک راہ دکھانا ہے — بادھائیں دور ہٹانا ہے
اِتہاس کے پنے لکھنے دو — گنگا جمنا کو ملنے دو

آخری شعر سن کر میرے دل کی عجیب کیفیت ہوگئی۔ ایسا محسوس ہوا کہ وہ بات گیت بن کر سڑکوں پر گونج رہی ہے جس کو سوامی ویویکانند نے سو سال پہلے کہا تھا کہ میں اپنے مستقبل کی آنکھ سے دیکھ رہا ہوں کہ اسلام باڈی اور ہندو برہن دونوں مل کر نئے شاندار انڈیا کی تعمیر کر رہے ہیں۔ دل میں یہ تمنا ابھری کہ گنگا اور جمنا کے یہ دھارے ایک ہو کر کاش ایک بڑا سیلاب بن سکیں۔

یہ شانتی یاترا جگہ جگہ سے گزرتی ہوئی ۱۵ دسمبر سے ۲۱ دسمبر تک جاری رہی۔ وہ پونہ سے شروع ہوئی پھر چاکن، منچر، سنگم نیر، ارادھنا، ادیان، ناندگاؤں، مالیگاؤں، شری رام پور، نواسا، اورنگ آباد، جالنا، بیڑ، عثمان آباد، لاتور، احمد پور، ناندیڑ، پربھنی، ہنگولی، آکولہ، امراوتی، سیوا گرام، وردھا، ناگپور پہنچی۔ ناگپور اس یاترا کا آخری مقام تھا۔

۱۵ دسمبر ۱۹۹۲ کو پونہ سے شانتی یاترا شروع ہوئی۔ اور ۲۰ اکتوبر کو ناگپور میں ختم ہوئی۔ ہر جگہ ٹیلی فون کے ذریعہ پیشگی طور پر تمام انتظامات مکمل کر لئے گئے تھے۔ اس علاقہ میں تناؤ کی وجہ سے جلسہ جلوس بالکل ممنوع ہے۔ مگر پونہ کے مسٹر شانتی لال موتھا کے انتھک سورخ اور ان کی کوششوں سے ہر جگہ کے لئے اجازت حاصل ہوگئی۔ اور یہ سب کچھ صرف چند دنوں میں انجام پایا۔

طریقہ یہ تھا کہ بستی میں داخل ہو کر پہلے ایک گھنٹہ یا دو گھنٹہ تک پیدل سفر (پدیاترا) کی جاتی۔

अखिल महाराष्ट्रीय जैन संघटना द्वारा आयोजीत

पुना से नागपुर शांतीयात्रा का अमरावती आगमन

मान्यवर,

विगत कुछ दिनोसे महाराष्ट्र राज्यमें हुई हिंसक घटनाओसे निर्माण हुये मनमुटाव के वातावरण को शांती और सद्भाव में बदलने हेतु और जीयो और जीने दो तथा अहिंसा परमोधर्म के तत्वोका संपुर्ण राज्यमें प्रसार करने हेतु अखिल महाराष्ट्रीय जैन संघटना द्वारा आयोजीत पुना से नागपूर शांतीयात्रा का आगमन अमरावती महानगरमें सोमवार दिनांक २१ दिसंबर को सुबह ८.०० बजे होरहा है। जिसमें निम्न महानुभाव

आचार्य सुशीलमुनीजी, दिल्ली
(जैन धर्म के जियो और जीने दो तथा अहिंसा परमोधर्म तत्व के विश्वप्रसारक)
स्वामी चिदानंदजी, दिल्ली(अध्यक्ष परमार्थ निकेतन , दिल्ली)

मौलाना वहीदुद्दीन खान (प्रेसीडेंट ऑफ इस्लामिक सेंटर)
शांतीलालजी मुथ्था (सर्वधर्मीय सामुहिक विवाह प्रणेते)

पद्मभूषण अण्णा हजारे ★ अमरेंद्र मुनी, दिल्ली ★ अब्दुल करीम फारूख, नागपूर ★ माधव गडकरी (माजी संपादक लोकसत्ता) ★ गोविंदभाई श्रॉफ (श्रेष्ठ समाजसेवक) ★ तात्यासाहेब शिरवाडकर (कुसुमाग्रज) ★ गंगाधर पानतावणे (साहित्यीक) ★ डॉ. यु.म.पठाण (साहित्यीक) ★ प्राचार्य मुंगुडकर एवं ★ हुसेनेकार हुसेन (अध्यक्ष फाईज-ए-आम-ट्रस्ट) आदी मान्यवर भी इस शांतीयात्रामें सहभागी होकर अंबापुरी नगरमें आगमन कर रहे है। जो सुबह ८.०० बजे सर्राफ बाजार स्थीत श्री जैन श्वेतांबर मंदीर से निकलकर अमरावती महानगरमें जीयो और जीने दो तथा अहिंसा परमोधर्म इस तत्वोंका प्रसार करने एवं शांती तथा सद्भाव का वातावरण बनाने निम्नो मार्गोसे भ्रमण करेंगे।

शांती यात्रा भ्रमण मार्ग

सक्करसाथ, छत्रपुरी चौकसे, इतवारा बाजार चौक, जवाहर गेट, प्रभात चौक, सरोज चौक, जयस्तंभ से सामरा काम्पलेक्स होतेहुये नेहरू मैदान के शहीद समारक में पहुचेंगी।

इस अवसरपर शांती यात्रा का समापन एवं बीदाई समारोह

अमरावती जिलाकी पालकमंत्री श्रीमती वसुधाताई देशमुख
अमरावती महानगरके महापौर डॉ. श्रीमान देवीसिंहजी शेखावत
अमरावती गृहनिर्माण मंडल के अध्यक्ष ॲड.श्रीमान केसरजी बोथरा

की उपस्थितीमें संपन्न होगा। आपसे विनम्र अनुरोध है की, इस महान कार्यमें सहभागी होने आपभी शांतीयात्रामें अपने मित्रोंसह सामील होईये।

— विनीत —

पुनमचंद बुवा ★ अभय कोटेचा ★ राजेंद्र सुनावत ★ मोहनलाल ओस्तवाल ★ नेमीचंद जैन
★ सुदर्शन गांग ★ प्रदीप जैन ★ अनिल कोठारी ★ कोमल बोथरा ★ नविन चोरडीया ★ अमृत मुथा
★ राजेंद्र भंसाली ★ महावीरकुमार चोरडीया ★ दिलीप सकलेचा ★ विजय बोथरा ★ प्रकाश भंसाली ★ विजय आचलीया
★ विजय भंसाली ★ शांतीलाल पारडीया ★ कंवरीलाल ओस्तवाल

जीयो और जीने दो का नारा है।

اس دوران لوگ بڑی تعداد میں نکل نکل کر ہمارے قافلہ میں شریک ہو جاتے۔ اس طرح یہ شانتی یاترا چلتی ہوئی کسی متعین مقام پر پہنچتی۔ یہاں پہلے سے اسٹیج تیار رہتا تھا۔ یہاں ہم لوگ ٹھہر کر تقریر کرتے جس میں امن اور تعمیر کی طرف متوجہ کیا جاتا۔ یہی طریقہ پورے سفر میں تمام مقامات پر جاری رہا۔

ہر جگہ لوگوں میں غیر معمولی جوش تھا۔ میں نے دیکھا کہ سڑک پر کوئی شکریا شرینی لاکر ہم لوگوں کو دے رہا ہے۔ کوئی ہار لئے چلا آرہا ہے۔ کوئی پھول پیش کر رہا ہے۔ غرض لوگوں میں عجیب جوش تھا۔ شانتی یاترا کے آخر میں ہونے والے جلسہ میں ہر جگہ لوگ بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔

یہ منظر دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کہ امن اور شانتی کی آواز ہر آدمی کے دل کی آواز ہے۔ امن اور شانتی کی آواز بلند کرنا گویا لوگوں کی فطرت کے تاروں کو چھیڑ دینا ہے۔ اور جو پکار فطرت انسانی کے مطابق ہو، اس کو لوگوں کی طرف سے لبیک ملنے میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی۔

چاکن میں داخل ہونے کے بعد پدیاترا، جلسہ اور دوسرے پروگرام کئے گئے۔ ملاقات کے دوران چاکن کے ایک صاحب نے پوچھا کہ شانتی یاترا نکالنے سے آپ کا مقصد کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کا مقصد انسان کی فطرت کو جگانا ہے۔ اس وقت دیش میں جھگڑے کی جو فضا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ کچھ لوگوں نے غلط باتیں کر کے انسان کو اس کی فطرت سے ہٹا دیا ہے۔ ہم انسان کو دوبارہ اس کی فطرت کی طرف واپس لانا چاہتے ہیں۔ اس دنیا میں، فطرت سے ہٹنے ہی کا نام بگاڑ ہے، اور فطرت پر قائم ہونے کا نام بناؤ۔

پھر میں نے کہا کہ سکھ والا سماج بے سکھ کو برداشت کرنے سے بنتا ہے۔ ضرورت ہے کہ لوگوں میں یہ مزاج بنایا جائے کہ کبھی کوئی کڑوی بات سامنے آجائے تو اس کو نظر انداز کر دیا جائے۔ کیوں کہ کبھی کبھی کوئی خلاف مزاج بات تو بہر حال پیش آئے گی۔ آپ جانتے ہیں کہ پھول میں بھی کانٹے ہوتے ہیں۔ پھر خدا کا باغ جب کانٹوں سے خالی نہیں تو ہمارا سماج کس طرح ایسی چیزوں سے خالی ہو سکتا ہے۔

منچر میں حسب پروگرام شانتی یاترا کی تمام کارروائی انجام پائی۔ کئی لوگوں سے باتیں ہوئیں۔ ایک صاحب نے کہا کہ آپ لوگوں نے اپنی شانتی یاترا مہاراشٹر سے کیوں شروع کی۔ میں ابھی کچھ بولا نہیں تھا کہ سوامی چیدانند نے کہا: آپ جانتے ہیں کہ اس اسٹیٹ کا نام مہاراشٹر ہے۔ دوسری ریاستیں

اگر راشٹر ہیں تو یہ مہا راشٹر ہے۔ اس لئے بالکل پنچرل تھا کہ اس کو پہلے لیا جائے۔ کیوں کہ ہمارا راشٹر میں شانتی آجائے تو اس کا اثر سارے راشٹر پر پڑے گا۔

اس سفر میں میری ملاقات ایک ہندو لیڈر سے ہوئی۔ وہ انتہا پسند ہندو گروپ سے تعلق رکھتے تھے۔ میں نے کہا کہ میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔ شرط یہ ہے کہ آپ کسی ریزرویشن کے بغیر مجھ سے بات کریں۔ وہ راضی ہوئے تو ہم دونوں ایک الگ کمرہ میں بیٹھے اور پھر دونوں میں بات شروع ہوئی۔

میں نے پوچھا کہ آپ ہندستانی مسلمانوں سے کیا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ایک لفظ میں یہ کہ (live or leave) یعنی بھارت میں رہنا ہے تو ہمارے کہنے کے مطابق رہو، ورنہ دیش چھوڑ کر چلے جاؤ۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ اب یہ بتائیے کہ مسلمان اگر دونوں میں سے کوئی کام نہ کریں، وہ نہ آپ کے کہنے پر چلیں اور نہ دیش کو چھوڑ کر باہر جائیں، تو پھر آپ کیا کریں گے۔

انھوں نے کہا کہ پھر ہم ان کو سبق سکھا دیں گے۔ میں نے کہا کہ وہ کیسے۔ انھوں نے کہا کہ ہندو ابھی تک اپنی طاقت کو نہیں جانتا تھا۔ اب رام مندر موومنٹ کا یہ فائدہ ہوا ہے کہ ہندو نے اپنی طاقت کو جان لیا ہے۔ آپ نے دیکھ لیا کہ ہندو طوفان کے مقابلہ میں بابری مسجد اور سپریم کورٹ کے فیصلے تنکے کی طرح بہہ گئے۔ پھر یہ مسلمان کس طرح اس سیلاب کا مقابلہ کریں گے۔

میں نے پوچھا کہ کیا آپ اپنی بات کہہ چکے۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ میں نے کہا کہ اجودھیا کا اسٹرکچر پتھروں کا ڈھیر تھا۔ سپریم کورٹ کا فیصلہ کچھ لفظوں کا مجموعہ تھا۔ آپ پتھر کے ڈھانچہ اور لفظوں کے مجموعہ کو انسان سے برابر (equate) کر رہے ہیں۔ آپ کا یہ ایکویشن غلط ہے۔ پتھروں کے ڈھانچے کسی طوفان میں گر سکتے ہیں۔ الفاظ کے اوراق کسی آندھی میں اڑ سکتے ہیں۔ مگر پندرہ کروڑ انسانوں کے اوپر رولر چلانا کسی طرح ممکن نہیں۔ میری یہ بات سن کر وہ خاموش ہو گئے۔

ہم سنگم نیر میں داخل ہوئے تو ہماری آگے کی جیپ پر اس کے الفاظ گونج رہے تھے۔۔۔ گنگا جمنا کو ملنے دو۔

ہماری پارٹی کے ایک شخص نے کہا کہ ہمارا دیش گنگا اور جمنا کا سنگم ہے۔ اسی طرح یہ دیش مختلف کلچر کا بھی سنگم ہے۔ سنگم نیر اگر دیش کے اس پہلو کی ایک مثال بن جائے تو یہ اس کے نام کے

لحاظ سے اس کے لئے سب سے اچھی بات ہوگی۔

ارادھنا دیان میں ہم لوگ ایک جین مندر میں گئے۔ وہاں کھانے کا انتظام تھا۔ اس کے مختلف حصوں کو دکھاتے ہوئے ہم کو ایک چھوٹے کمرے میں لے جایا گیا۔ یہاں ایک بستر بچھا ہوا تھا۔ اس پر ایک بوڑھے آدمی لیٹے ہوئے تھے۔ چادر اٹھائی گئی تو میں نے دیکھا کہ وہ بالکل دبلے ہو چکے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہڈی کے ڈھانچہ کے اوپر ایک سوکھی کھال لپٹی ہوئی ہے۔ بولنے کی طاقت بھی ان میں باقی نہیں رہی تھی۔ تاہم آنکھ کھول کر وہ آنے جانے والے کو دیکھ سکتے تھے۔

پہلے میں نے سمجھا کہ بیماری کی وجہ سے ان کا یہ حال ہوا ہے۔ مگر پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ جین مذہب کے مطابق وہ عمل کر رہے ہیں جس کو سنتھارا کہا جاتا ہے۔ یہ طریقہ صرف جین دھرم میں ہے۔ اس میں آدمی خود اپنے ارادہ سے ہر قسم کا کھانا اور پانی مکمل طور پر چھوڑ دیتا ہے۔ وہ اسی طرح بھوکا پیاسا پڑا رہتا ہے، یہاں تک کہ ایک دن مر جاتا ہے۔ ایک جینی اچاریہ نے اس کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ ہم مرتیو سے نہیں مرتے، ہم اپنی مرضی سے شریر چھوڑ دیتے ہیں۔ دوسرے جینی نے کہا: ڈسس کئے جانے سے پہلے ہم خود ہی رزائن کر دیتے ہیں۔

اس دنیا میں کوئی شخص کتنا ہی زیادہ غیر معقول رویہ اختیار کرے، اس کو بہر حال اپنے عمل کو درست ثابت کرنے کے لئے الفاظ مل جائیں گے۔ اچاریہ منی سوشیل کمار نے یہ لطیفہ بتایا کہ غلام احمد قادیانی نے ایک عورت سے یہ کہہ کر نکاح کیا کہ اس سے ایک لڑکا پیدا ہوگا جو میری جانشینی کرے گا۔ نکاح ہو گیا مگر اس خاتون سے کوئی لڑکا پیدا نہ ہو سکا۔ بلکہ دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ ایک اردو اخبار نے مرزا صاحب کی اس بات کو نقل کرتے ہوئے ان کا مذاق اڑایا۔ مرزا صاحب نے جواب دیا: اس عقل کے اندھے کو پتہ نہیں کہ دو اٹھنی مل کر ایک روپیہ بن جاتا ہے۔ تمثیل کے ذریعہ استدلال کتنا کمزور ہوتا ہے، یہ واقعہ اس کی ایک دلچسپ مثال ہے۔

مالیگاؤں میں ۷ دسمبر کی رات گذاری۔ پدیاترا کے بعد ایک بڑا اجتماع ہوا۔ ہندو اور مسلمان دونوں اس میں بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ دوسرے لوگوں کی تقریروں کے ساتھ میری بھی تقریر ہوئی۔ اگلی صبح کو فجر کی نماز کے بعد کچھ لوگ ملاقات کے لئے قیام گاہ پر آئے۔ جناب محمد لقمان صاحب نے وہاں کے ایک صاحب کے بارہ میں بتایا کہ کل وہ میرے ساتھ آپ کو سننے

کے لئے آئے تھے۔ راستہ میں وہ مجھ سے جہاد کی باتیں کرتے رہے۔ مگر جب آپ کی باتیں سن کر واپس ہوئے تو انھوں نے کہا کہ میرا دماغ بالکل دھل گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ جہاد کا وقت نہیں ہے بلکہ صبر کا وقت ہے۔ اور یہ کہ صبر کوئی منفعل حالت نہیں، وہ زبردست عمل ہے۔ اور آج اسی صابرانہ عمل کی ضرورت ہے۔

اس یاترا کے دوران ہم لوگ جہاں جہاں گئے، ہر جگہ نئے نئے تجربے حاصل ہوئے۔ ۱۶ دسمبر کو ہم ناندگاؤں کی سڑکوں پر چلتے ہوئے ایک مقام پر پہنچے۔ یہاں کئی دکانیں جلی ہوئی نظر آئیں۔ ایک دکان سے ابھی تک دھواں اٹھ رہا تھا اور پائپ کے ذریعہ وہاں پانی ڈال کر اس کو آخری طور پر بجھایا جا رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر دل کو سخت جھٹکا لگا۔ میں نے سوچا کہ اپنی دکان ہو تو آدمی اس کو نہایت شوق کے ساتھ سنوارتا ہے، اور جو دکان دوسرے کی ہو اس کو بے رحمی کے ساتھ آگ لگا دیتا ہے۔ خود غرضی کا دین بھی کیسا عجیب ہے۔

آگے بڑھے تو ایک اسکول کے چھوٹے بچے یونیفارم میں آگئے اور ہمارے ساتھ اپنے ننھے پیروں کے ساتھ چلنے لگے۔ ان کو دیکھ کر مجھے کسی کا یہ قول یاد آیا کہ جب بھی کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ اس بات کی علامت ہوتا ہے کہ خدا انسانوں سے مایوس نہیں ہوا۔ سوامی چید انند نے اپنی تقریر میں کہا کہ ناندگاؤں میں اس قسم کا دنگا پہلی بار ہوا ہے۔ میں کہوں گا کہ آپ لوگ یہ طے کر لیں کہ یہی پہلی بار بھی ہو اور یہی آخری بار بھی۔

مالیگاؤں میں پدیاترا بہت لمبی رہی۔ میرا گمان تھا کہ مالیگاؤں ایک چھوٹا قصبہ ہے۔ مگر معلوم ہوا کہ وہ کافی بڑا ہے اور بالکل شہر کی مانند ہے۔ مالیگاؤں میں ہم لوگ شام کو پہنچے۔ پدیاترا کے بعد تقریروں کا پروگرام تھا۔ کافی لوگ شریک ہوئے۔ صبح کو وہاں سے روانگی تھی۔ ابھی تک وہاں رات کا کرفیو چل رہا تھا۔ یہاں الرسالہ کے قارئین بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ مگر بہت کم لوگوں سے ملاقات ہو سکی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مقامی پبلسٹی نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کو میری آمد کا علم نہ ہو سکا۔

شری رام پور میں حسب معمول تمام پروگرام ہوئے اور کافی کامیاب رہے۔ ملاقاتوں کے دوران شری رام پور کا ایک سبق آموز قصہ معلوم ہوا۔ یہاں ایک بزرگ کی قبر ہے۔ ۶ دسمبر کے بعد کسی شر پسند آدمی نے رات کے وقت قبر کو توڑ ڈالا۔ اس قسم کا ایک واقعہ عام طور پر دو فرقوں میں کشیدگی

اور پھر خونیں فساد کا سبب بن جاتا ہے۔ مگر شری رام پور میں ایسا نہیں ہوا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب یہ قصہ پیش آیا تو فوراً ہی بستی کے ہندو اور مسلمان وہاں پہنچے۔ اور دونوں نے مل کر قبر کو پھر سے بنایا۔ اور پھر اس کے اوپر حسب قاعدہ چادر چڑھائی۔ اس طرح انھوں نے فساد کے بم کو ڈیفیوز کر دیا۔ یہ واقعہ ۷ دسمبر کو مجھے معلوم ہوا جب کہ میں شانتی یاترا کے تحت شری رام پور میں پہنچا تھا۔

۷ دسمبر کی شام کو ہم نواسا پہنچے۔ یہاں پدیاترا کے بعد حسب معمول جلسہ ہوا جس میں ہمارے ساتھیوں نے تقریریں کیں۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ زندگی میں کبھی کبھی اختلاف کا پیدا ہونا عین فطری ہے۔ ایسا ہمیشہ ہوگا۔ خواہ وہ ایک سماج ہو یا کوئی دوسرا سماج۔ پھر اس کا حل کیا ہے۔

میں نے کچھ واقعات بتاتے ہوئے کہا کہ اس کے حل کے لئے میں آپ کو دو آسان نسخہ بتاتا ہوں۔ ایک یہ کہ ـــــ دوری کو دور کیجئے۔ یعنی ایک فرقہ اور دوسرے فرقہ کے لوگ آپس میں خوب ملیں۔ وہ باہمی دوری کو ختم کریں۔ اس کے بعد بہت سی غلط فہمیاں اپنے آپ ختم ہو جائیں گی۔

دوسرے یہ کہ جب جھگڑے یا اختلاف کی صورت پیدا ہو تو ایسے موقع پر آپ کا اصول ہونا چاہئے ـــــ ٹکراؤ نہیں، تدبیر۔ یعنی ایسے مواقع پر آپ ٹکراؤ کا طریقہ اختیار نہ کریں بلکہ تدبیر کا طریقہ اختیار کریں۔ آپ بم پر بم نہ ماریں بلکہ بم کو ڈیفیوز کر دیں۔ اگر آپ ایسا کریں تو آپ جھگڑے کو اس کے پہلے ہی مرحلہ میں ختم کر دیں گے۔

میری تقریر کے بعد کچھ ہندو نوجوان مجھ سے ملے۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے کبھی اس طرح سوچا نہیں تھا۔ مگر آج سمجھ میں آیا کہ یہی اصل بات ہے اور ہمیں ایسا ہی کرنا چاہئے۔

میں نے بتایا کہ اس کی ایک مثال دسمبر ۱۹۹۲ میں ہونے والا دہلی کا فساد ہے۔ دہلی میں ۱۲ دسمبر کو میری ملاقات ایک صاحب سے ہوئی۔ انھوں نے غصہ کے ساتھ کہا "اس وقت ایسٹ دہلی میں آگ لگی ہوئی ہے۔ یہ ہندو مسلم فساد نہیں، یہ پولیس مسلم فساد ہے۔"

یہ بات انھوں نے ویلکم کالونی کے فساد کے بارہ میں کہی تھی۔ مگر جس ایسٹ دہلی میں ویلکم کالونی ہے، اسی ایسٹ دہلی میں عین اس کے پاس ہی گونڈہ کالونی ہے۔ اور گونڈہ کالونی میں نہ کوئی فساد ہوا اور نہ کرفیو لگا۔ حالانکہ وہاں بھی "سازش" کے وہی واقعات ہوئے جس کا حوالہ دوسرے مقامات

پر دیا جاتا ہے۔

۱۳ دسمبر ۱۹۹۲ کو میری ملاقات مولانا محمد قاسم قاسمی سے ہوئی۔ وہ مدرسہ حسین بخش میں استاد ہیں اور گونڈہ کالونی میں اپنے بچوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ ۸ دسمبر کو جب پرانی دہلی میں فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا ہوئی تو فوراً وہ گونڈہ کالونی چلے گئے اور ایک ہفتہ تک مسلسل وہیں رہے۔ انھوں نے ذاتی واقفیت کے تحت کئی واقعات بتائے۔

انھوں نے بتایا کہ گونڈہ کالونی میں ایک ہندو کالج ہے۔ مسلمانوں کو معلوم ہوا کہ اس کالج میں ہتھیار جمع کئے گئے ہیں اور لڑکے وہاں اکٹھا ہو کر باقاعدہ فساد کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ کچھ مسلمانوں نے فوراً پولیس کے ذمہ داروں کو ٹیلی فون کیا اور انھیں بتایا کہ یہاں فساد کا خطرہ ہے، آپ لوگ اس کو روکنے کی کارروائی کریں۔ اس کے بعد پولیس کی ایک پارٹی کالج میں داخل ہوئی۔ اس نے تلاشی لی تو خبر صحیح نکلی۔ پولیس نے اسی وقت تمام ہتھیار اپنے قبضہ میں کر لئے اور لڑکوں کو گرفتار کر لیا۔

اسی طرح گونڈہ کالونی کے مسلمانوں کو معلوم ہوا کہ ایک ہندو وکیل کے مکان کے اوپری حصہ میں گولہ بارود جمع ہے اور وہاں بم بنائے جا رہے ہیں۔ تحقیق کر لینے کے بعد کچھ سمجھدار مسلمان اس ہندو وکیل کے یہاں گئے اور اس سے کہا کہ آپ کے اوپر جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب ہم کو معلوم ہو چکا ہے۔ اب آپ یا تو سارا سامان ضائع کر دیں، ورنہ ہم پولیس کو بلاتے ہیں۔ ہندو وکیل نے معافی مانگی اور اسی وقت تمام سامان ضائع کر دیا۔

ایک رات کو کارسیوکوں کی ایک گاڑی گونڈہ کالونی میں آگئی۔ وہ ہر ہر مہادیو کے نعرے لگانے لگے۔ اس کو سن کر کچھ مسلم نوجوان باہر نکل آئے۔ انھوں نے بھی اللہ اکبر کے نعرے لگانے شروع کر دئے۔ اس وقت فوراً کچھ سنجیدہ مسلمان باہر آئے۔ انھوں نے مسلم نوجوانوں کو روکا اور پولیس کو ٹیلی فون کر کے بلایا۔ پولیس نے اسی وقت کارروائی کر کے کارسیوکوں کو وہاں سے بھگا دیا۔

مولانا قاسم صاحب نے بتایا کہ ۶ دسمبر کے بعد جب کشیدگی پیدا ہوئی تو فوراً ہی گونڈہ کالونی والوں نے باہم مشورہ سے امن کمیٹی بنائی۔ اس میں ہندو اور مسلمان دونوں کو شریک کیا۔

امن کمیٹی کے فیصلہ کے مطابق، کالونی کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک ٹیم پہرہ داری کے لئے مقرر کی گئی۔ اس میں کوئی نوجوان نہیں لیا گیا۔ سب ادھیڑ عمر کے لوگ شامل تھے۔ ان کوششوں کے نتیجہ میں عین فساد کے زمانہ میں بھی گونڈہ کالونی پوری طرح فساد سے محفوظ رہی۔ حتی کہ وہاں کرفیو لگانے کی نوبت بھی نہیں آئی۔

فساد کے بم سے بچنے کی واحد تدبیر یہ ہے کہ دانش مندی کے ذریعہ فساد کے بم کو ڈیفیوز کر دیا جائے۔ فرقہ وارانہ فساد کے نقصان سے بچنے کی اس کے سوا کوئی بھی دوسری تدبیر نہیں۔

اورنگ آباد میں شانتی یاترا کا پروگرام معمول کے مطابق مکمل کرنے کے بعد ہم نے یہاں کے گیسٹ ہاؤس میں رات گزاری۔ مجھے یاد آیا کہ سر جادو ناتھ سرکار نے اپنی تاریخی کتاب (Aurangzeb) میں لکھا ہے کہ ۱۶۵۸ء میں جب کہ انڈیا میں اورنگ زیب کی حکومت تھی۔ اورنگ آباد میں اجناس کا ریٹ یہ تھا: گیہوں اور دال ایک روپیہ میں ڈھائی من، جوار اور باجرا ایک روپیہ میں ساڑھے تین من، گڑ ایک روپیہ میں آدھا من، گھی ایک روپیہ میں چار سیر (جلد ۱، صفحہ ۱۷۳)

یہ ساڑھے تین سو سال پہلے کی بات ہے۔ اس وقت روپیہ مہنگا تھا اور چیزیں سستی تھیں۔ اب چیزیں مہنگی ہیں اور روپیہ سستا ہے۔ عام انسان کے لئے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ البتہ یہ کہ قدیم انسان کے لئے مزید یہ تھا کہ اس کو سکون کی نعمت حاصل رہتی تھی۔ جب کہ آج یہ حالت ہے کہ نہ کم والے کو سکون ہے اور نہ زیادہ والے کو۔

جالنہ میں پدیاترا کے بعد بہت بڑا اجتماع ہوا۔ دور تک آدمی ہی آدمی دکھائی دے رہے تھے۔ تقریروں میں شام ہوگئی۔ یہاں شام سے صبح تک کا کرفیو چل رہا ہے۔ لوگ نہایت دلچسپی کے ساتھ سن رہے تھے۔ مگر کرفیو کے اندیشہ کی وجہ سے آخر میں اٹھنے لگے۔ جالنہ کے پولیس سپرنٹنڈنٹ منچ کے سامنے زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے فوراً اعلان کرایا کہ آپ لوگ کرفیو کا دھیان نہ کریں۔ آخر تک یہاں کے بیانات کو سنیں۔ اور اس کے بعد اطمینان کے ساتھ اپنے گھروں کو واپس جائیں۔ چنانچہ جلسہ کی کارروائی مزید دیر تک جاری رہی۔

میں نے جالنہ کی تقریر میں کہا کہ یہاں اتنے آدمی ہیں جیسے کہ پوری بستی امنڈ آئی ہے۔ اس

سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ امن و شانتی کے کتنے زیادہ خواہش مند ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام انسان امن و سکون ہی کو پسند کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں کیا وجہ ہے کہ کبھی کبھی ہمارے درمیان دنگا ہو جاتا ہے۔

میں نے کہا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض چیزیں جس کو بھلاوے کے خانہ میں ڈالنا تھا اس کو ہم عمل کے خانہ میں ڈال دیتے ہیں۔ پیدا کرنے والے نے جب انسان کو پیدا کیا تو اسی کے ساتھ اس نے ایک اور چیز پیدا کی جس کو آپ گلاب کہتے ہیں۔ گلاب کا پھول پھولوں کا راجہ ہے۔ کتنا اچھا ہوتا ہے وہ۔ لیکن گلاب کا پھول جس ڈنٹھل میں اگتا ہے، اس میں ساتھ ہی کانٹے بھی ہوتے ہیں۔ اس طرح گویا فطرت کے ایک واقعہ کی زبان میں یہ پیغام دیا گیا کہ اس دنیا میں ہمیشہ پھول کے ساتھ کانٹے بھی ہوں گے۔ یہاں اگر پھول لینا ہے تو کانٹے کو نظر انداز کرنا ہوگا۔ کانٹے کو نظر انداز کئے بغیر اس دنیا میں پھول جیسی قیمتی چیز نہیں مل سکتی۔ اسی اصول پر ہمیں اپنی سماجی زندگی کو چلانا چاہئے۔

۱۸ دسمبر کو بیڑ پہنچے۔ بے شمار لوگ شانتی یاترا میں شریک ہو گئے۔ آخر میں جب اجتماع ہوا تو اتنے آدمی اکٹھا ہوئے کہ دور دور تک آدمی ہی آدمی دکھائی دیتے تھے۔ دوسروں کے ساتھ میری بھی کسی قدر مفصل تقریر ہوئی۔ تقریر کے بعد بہت سے لوگوں نے غیر معمولی تاثر کا اظہار کیا۔ ایک مقامی ہندو جرنلسٹ راجندر منت نے بتایا کہ میں آگے منچ کے پاس بیٹھا تھا۔ میرے قریب ہی یہاں کے کلکٹر مسٹر سنجے کمار شرما بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ آپ کی تقریر بہت غور سے سن رہے تھے اور اس سے اثر لے رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ آپ کی تقریر سنتے ہوئے ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

احمد پور میں شانتی یاترا کے پروگرام کی تکمیل کے بعد ایک ہندو لیڈر مسٹر کیدار سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ ۶ دسمبر کے بعد کاپیٹی میں کچھ واقعات ہوئے۔ اس میں ایک مندر بھی توڑ دیا گیا۔ اس کے بعد وہاں ہندو اور مسلمان جمع ہوئے۔ سب نے اس کام کی مذمت کی اور طے کیا کہ دونوں مل کر دوبارہ مندر تعمیر کریں گے۔ چنانچہ دونوں فرقہ کے لوگوں نے مل کر خود اپنے ہاتھ سے مندر کی نئی تعمیر کی۔ اس میں کوئی بھی سرکاری امداد قبول نہیں کی گئی۔

۱۹ دسمبر ۱۹۹۲ کو دوپہر کے وقت ہمارا قافلہ لاتور پہنچا۔ لاتور (Latur) کا نام پہلے لتا لور

(Lattalur) تھا۔ لتالور کا لفظ ادائگی میں مشکل تھا، اس لیے وہ دھیرے دھیرے لاتور ہوگیا۔ یہی مثال ہر معاملہ کی ہے۔ عوام ہمیشہ اس چیز کو قبول کرتے ہیں جو انھیں آسان معلوم ہوتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ سطحی اسکیمیں، بہت جلد لوگوں کے درمیان مقبول ہو جاتی ہیں اور گہرے اور دور رس منصوبے لوگوں کو اپیل نہیں کرتے۔

لاتور جنوبی ہند کے اس علاقہ میں ہے جس کو دکن کہا جاتا ہے۔ پہلے یہ ریاست حیدرآباد کا حصہ تھا۔ یہاں مسلمان تقریباً ۲۵ فی صد کی تعداد میں آباد ہیں۔

حسب معمول لاتور کی سرحد پر پہنچ کر ہم لوگ گاڑی سے اتر گئے اور سڑکوں پر پیدل چلتے ہوئے آگے بڑھے۔ پدیاترا کے دوران ہم ایک مقام پر پہنچے۔ یہاں ایک نیا منظر ہمارے سامنے تھا۔ یہ ایک بڑا مندر تھا، اس کے چاروں طرف دکانیں بنی ہوئی تھیں۔ ان دکانوں کی تعداد ۸۰ تھی۔ گویا یہ ایک مندر کامپلکس تھا۔ اس مندر کے چاروں طرف سولہ راستے تھے۔ یعنی ۱۶ سڑکیں جو مندر سے شروع ہو کر شہر کی طرف جا رہی تھیں اس قسم کا مندر میں نے پہلی بار دیکھا۔

اس مندر کے قریب ہی ایک مسجد کا نیا گنبد دکھائی دے رہا تھا۔ یہ ایک زیر تعمیر مسجد تھی جو اب تکمیل کے آخری مرحلہ میں تھی۔ لوگوں نے بتایا کہ یہ بہت بڑی مسجد ہے۔ قدیم مسجد میں کافی توسیع کر کے تقریباً ۵۰ لاکھ روپیہ کی لاگت سے اس کو از سر نو بنوایا جا رہا ہے۔

ہم نے پایا کہ یہاں اگرچہ دونوں پاس پاس ہیں مگر نہ مسجد والوں کو مندر سے کوئی شکایت ہے اور نہ مندر والوں کو مسجد سے کوئی شکایت۔ لاتور کے ہندو اور مسلمان دونوں مل جل کر امن کیساتھ رہ رہے ہیں۔ حالیہ ہنگامہ خیز دنوں میں بھی یہاں فرقہ وارانہ کشیدگی جیسی کوئی چیز پیدا نہیں ہوئی۔

یہاں کے مسلمانوں کو پُرامن زندگی کی یہ قیمت ملی ہے کہ اس علاقہ میں وہ خوشحالی کے لیے مشہور ہیں۔ وہ بڑی بڑی تجارتیں کر رہے ہیں۔ اس لیے لاتور اس بے بنیاد نظریہ کی تردید ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات کا تعلق دراصل اس بات سے ہے کہ لوگ اس حقیقت کو بھول جائیں کہ زندگی کا ایک لازمی اصول اعراض ہے۔ اجتماعی زندگی میں ناخوش گواریاں ضرور پیش آتی ہیں۔ ایسے مواقع پر اعراض نہ کرنے سے فساد ہوتا ہے، اور اعراض کا طریقہ اختیار کرنا ہر فساد کو روک دیتا ہے۔

۱۹ دسمبر کا پروگرام مکمل کرنے کے بعد آج کی رات ناندیڑ میں گزاری۔ یہاں ایک ہندو تاجر

ہمارے میزبان تھے۔ ناندیڑ میں بڑی تعداد میں الرسالہ کے قارئین موجود ہیں۔ مگر شانتی یاترا کا پروگرام بہت کم وقت میں بنا تھا۔ اس لئے مقامی طور پر اس کی زیادہ پبلسٹی نہ ہو سکی۔ چنانچہ قارئین الرسالہ کی بہت تھوڑی تعداد سے ملاقات ہو سکی۔

آل انڈیا ریڈیو (ناندیڑ) کی ٹیم نے ایک انٹرویو لیا۔ اس انٹرویو کا موضوع اسلام تھا۔ انٹرویور نے پوچھا کہ اسلام کیا ہے، اس کے بارہ میں آپ ہمارے سننے والوں کو بتائیں۔ میں نے قرآن اور حدیث کی روشنی میں، منٹ تک کچھ بنیادی باتیں بتائیں۔ میں نے خاص طور پر دو آیتوں کی تشریح کی۔ ان مع العسر یسرا۔ اور و اما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض۔

اس سفر کے دوران میں نے محسوس کیا کہ ہندو صاحبان اسلام کے بارہ میں سننا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ جب بھی میں نے اسلام کے حوالے کے بغیر عمومی انداز میں کچھ کہنا چاہا تو انھوں نے تقاضا کیا کہ آپ اسلام کے حوالے سے ہمیں بتائیں۔ ہم ایک عالم کی زبان سے یہ سننا چاہتے ہیں کہ اسلام کیا ہے۔

ناندیڑ میں ہمارا رات کا قیام مسٹر پرکاش چند سیٹھی کے نئے تعمیر شدہ گیسٹ ہاؤس میں تھا۔ وہ ٹرانسپورٹ کا بزنس کرتے ہیں۔ ان کی کمپنی کا نام سری شانتی روڈ ویز ہے۔ میری عادت ہے کہ میں ہر آدمی سے اس کے اپنے میدان کی بات کرتا ہوں۔ مجھے ہمیشہ سنانے سے زیادہ سننے کا شوق رہتا ہے۔ میں نے مسٹر سیٹھی سے کہا کہ ہم نے اس سفر کے دوران سڑکوں پر جو ٹرک الٹے ہوئے دیکھے۔ آخر سڑک کے یہ حادثات کیوں ہوتے ہیں۔ کیا اس کا سبب انجن کی خرابی ہے۔

انھوں نے کہا کہ نہیں۔ بہت ہی کم ایسا ہوتا ہے کہ سڑک کا کوئی حادثہ انجن کی خرابی کی وجہ سے ہو۔ وہ تقریباً ہمیشہ ڈرائیور کی غلطی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جو گاڑیاں اس وقت استعمال ہو رہی ہیں، ان کے بریک اتنے مضبوط ہوتے ہیں کہ بہت ہی کم اس کا چانس ہوتا ہے کہ وہ فیل ہو جائیں۔ اصل یہ ہے کہ ڈرائیور کبھی نشہ میں ہوتا ہے۔ کبھی رات کو گاڑی چلاتے ہوئے اس کو جھپکی آجاتی ہے۔ اس بنا پر حادثہ پیش آجاتا ہے۔

میں نے سوچا کہ انسانی زندگی کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ عام انسانوں کی حیثیت گاڑی جیسی ہے، اور لیڈر کی حیثیت ڈرائیور جیسی۔ سماج میں جو فسادات پیش آتے ہیں وہ حقیقۃً عام انسانوں کی

کسی خرابی کی وجہ سے پیش نہیں آتے۔ وہ ہمیشہ لیڈروں کی نالائقی کی وجہ سے پیش آتے ہیں۔ اگر یہ لیڈر اپنے گھروں میں چپ ہو کر بیٹھ جائیں تو موجودہ فسادات اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔ کیوں کہ اس کے بعد فطرت انسانوں کی رہنما ہوگی۔ اور فطرت کبھی رہنمائی میں غلطی نہیں کرتی۔

ناندیڑ میں ہم لوگ یہاں کا مشہور گوردوارہ دیکھنے گئے جو گرو گوبند سنگھ کے نام پر بنا ہے۔ یہ بہت بڑا اور بہت صاف ستھرا ہے۔ وہ ایک مکمل سکھ ادارے کے طور پر چلایا جا رہا ہے۔

گرو گوبند سنگھ سکھوں کے دسویں اور آخری گرو ہیں۔ وہ ۱۶۶۶ میں پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے خالصہ تنظیم قائم کی جو ایک مسلح سکھ تنظیم تھی۔ وہ پنجابی کے علاوہ فارسی، عربی اور سنسکرت زبانیں بخوبی جانتے تھے۔ انھوں نے دسم گرنتھ کو مرتب کیا۔

ایک روز وہ اپنے مریدین کے درمیان تھے۔ لمبے مراقبہ کے بعد اچانک انھوں نے سر اٹھایا اور کہا کہ میری تلوار ایک سر مانگتی ہے۔ تم میں سے کون یہ قربانی دینے کے لئے تیار ہے۔ اضطراب اور خاموشی کے ایک وقفہ کے بعد ایک شخص اٹھا۔ اس نے کہا کہ میں اس قربانی کے لئے تیار ہوں۔ گوبند سنگھ اور وہ آدمی دونوں ایک بند خیمہ میں چلے گئے۔ کچھ دیر کے بعد گوبند سنگھ خون آلود تلوار کے ساتھ باہر آئے۔ اور دوبارہ اسی قسم کی قربانی کی مانگ کی۔

یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا۔ یہاں تک کہ ایک کے بعد ایک پانچ آدمی "قربان" ہو گئے۔ آخر میں پانچوں آدمی زندہ حالت میں باہر آئے۔ گرو گوبند سنگھ نے صرف ان کی وفاداری کو آزمایا تھا۔ اس کے بعد ان پانچ افراد کو "پنج پیارا" کا لقب دیا گیا۔ یہ اس خالصہ تنظیم کے بنیادی ارکان تھے جو انھوں نے ۱۶۹۹ میں قائم کی۔

گرو گوبند سنگھ سکھوں میں فائٹنگ اسپرٹ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے ایک طرف مغلوں سے اور دوسری طرف پہاڑی قبائل سے جنگ چھیڑ دی۔ اس جنگ میں انھوں نے غیر معمولی بہادری دکھائی۔ تاہم ۷ اکتوبر ۱۷۰۸ء میں وہ ناندیڑ میں قتل کر دیے گئے۔ ان کی قتل گاہ پر ناندیڑ کا موجودہ گوردوارہ بنا ہوا ہے۔

مغل دار و گیر کے زمانہ میں گوردواروں کی ایک بڑی تعداد ہندو مہنتوں کے قبضہ میں چلی گئی۔ برٹش دور میں سکھوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ کوشش کے بعد آخر کار برٹش حکومت

نے ۱۹۲۵ میں سکھ گوردوارہ ایکٹ پاس کیا۔ اس کے تحت تمام گوردوارے دوبارہ سکھوں کو واپس مل گئے۔
(IV/805)

یہی قصہ ایک اور شکل میں مسلمانوں کے ساتھ پیش آیا۔ برٹش دور میں مسلمانوں کی بہت سی مسجدیں اور مقبرے وغیرہ آرکیالوجی کے قبضہ میں چلے گئے۔ مگر مسلم رہنما انگریزوں کے خلاف سیاسی لڑائی لڑنے میں اتنا زیادہ مشغول ہوئے کہ ان کو یاد نہ رہا کہ کثیر تعداد میں مسجدیں اور دوسرے بڑے بڑے مسلم مقامات آثار قدیمہ کے قانون کے تحت سرکاری قبضہ میں چلے گئے ہیں۔ انھوں نے اس سلسلہ میں واگزاری کی کوشش نہ کی۔ یہاں تک کہ ملک آزاد ہو گیا۔ آزادی کے بعد جو نئے حالات پیدا ہوئے۔ اس نے مسلمانوں کے لئے اس معاملہ میں مزید شدید تر مسائل پیدا کر دئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ انتہائی قیمتی جگہیں بدستور سرکار کے محکمہ آثار قدیمہ کے قبضہ میں باقی رہ گئیں۔

۲۰ دسمبر کو ساڑھے دس بجے ہم پربھنی میں داخل ہوئے۔ شانتی یاترا یہاں کی سڑکوں پر گزرتی ہوئی ایک مقام پر پہنچی۔ یہاں کافی بڑا جلسہ ہوا۔ اس موقع پر ہماری پارٹی کے مختلف لوگوں نے تقریریں کیں۔

ٹائمس آف انڈیا (۱۹ دسمبر ۱۹۹۲) میں درمیانی صفحہ پر ایک مضمون تھا۔ اس کا عنوان تھا:

The Disorientation Goes on

اس مضمون میں بتایا گیا تھا کہ انڈیا میں اصل مسئلہ رخ سے بے رخ ہونے (disorientation) کا ہے۔ یہاں ہمارے لئے عمل کا رخ بگڑ گیا ہے۔ میں نے اس عنوان کو لے کر تقریر کی۔ میں نے کہا کہ اصل واقعہ یہی ہے کہ ۱۹۴۷ کے بعد ہمیں جس رخ پر اپنی کوششوں کو جاری کرنا چاہئے تھا، اس رخ پر ہم اپنی کوششوں کو جاری نہ کر سکے۔ اس لئے ہماری تمام کوششیں بے نتیجہ ہو کر رہ گئیں۔ آزادی کے بعد ہر ایک نے یہ کیا کہ دوسروں سے وہ اپنے جھگڑے نپٹانے میں لگ گیا۔ مثلاً اپنی زبان کو منوانا اور لسانی اسٹیٹ بنانا۔ اپنے مذہبی قانون کو منوانا اور اپنے لئے علیحدہ قانون بنوانا۔ اپنے تشخص کا مطالبہ لے کر اٹھنا اور دوسروں سے اس بات پر لڑنا کہ ہمارا تشخص بحال کرو۔

یہ سب کوششوں کے غلط رخ تھے۔ اصل رخ صرف ایک تھا، اور وہ تعلیم تھا۔ اگر ۱۹۴۷ کے بعد

سارا زور تعلیم پر دیا گیا ہوتا تو ہمارے بقیہ مسائل اپنے آپ حل ہو جاتے۔ قوم کو تعلیم یافتہ بنانا قوم کو باشعور بنانا ہے۔ اور جو لوگ باشعور ہو جائیں ان کے بقیہ تمام مسائل اپنے آپ حل ہوتے چلے جاتے ہیں۔

ہنگولی میں شانتی یاترا کے بعد حسب معمول جلسہ ہوا۔ اس میں مختلف لوگوں نے تقریریں کیں۔ میں نے اپنی تقریر میں مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تمام مسلمان علامہ اقبال کے پرستار ہیں۔ علامہ اقبال نے ایک حدیث کے حوالے سے کہا ہے کہ ہندستان وہ ملک ہے جس کے بارہ میں پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ اس کی طرف سے مجھ کو ٹھنڈی ہوائیں آتی ہیں:

میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

میں نے کہا کہ ہمارے پیغمبر کو جس ملک میں ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں، وہاں رہ کر ہم کو بھی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ملنے چاہئیں۔ جہاں پیغمبر کو ٹھنڈی ہوا ملی وہاں ہم کو گرم ہوا ملے تو ہم کو اس جگہ سے شکایت نہیں ہونی چاہئے بلکہ خود اپنا احتساب کرنا چاہئے کہ ایسا کو نہیں کہ خود ہماری کسی غلطی سے وہاں کی ٹھنڈی ہوا ہمارے لئے گرم ہوا بن گئی ہو۔

میں نے کہا کہ میرے نزدیک اصل معاملہ یہی ہے۔ ہم اس ملک میں پیغمبر والے احساس کے ساتھ نہیں رہ رہے ہیں۔ وہ صبر کے احساس کے ساتھ رہتے تھے۔ ہم بے صبری کے احساس کے ساتھ رہتے ہیں۔ اسی فرق کی وجہ سے ایسا ہوا ہے کہ ٹھنڈی ہواؤں کا دیش ہمارے لئے گرم ہواؤں کا دیش بن گیا ہے۔

۲۰ دسمبر کو ہم آکولہ میں تھے۔ پروگرام کی تکمیل کے بعد شام کا کھانا ہم لوگوں نے یہاں کے ایک تاجر مسٹر دلیپ کوٹھاری (Tel. 26688) کے یہاں کھایا۔ کھانے کے بعد واش بیسن پر ہاتھ دھو رہا تھا۔ ایک نوجوان تولیہ لے کر آیا۔ اس نے کہا: مولانا صاحب، میرا نام محبوب ہے، میرے لئے دعا کریں۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ تندرست اور خوش پوش نظر آیا۔ اس نے کہا کہ یہ لوگ مجھ کو بہت مانتے ہیں۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہونے دیتے۔

اس کے بعد مسٹر کوٹھاری نے کہا کہ ہمارے علاقہ میں کوئی بھید بھاؤ نہیں۔ دیکھئے یہ مسلمان لڑکا ہمارے یہاں دس سال سے گھریلو ملازم کے طور پر ہے۔ مگر ہم اس کو اپنے بیٹے کی طرح رکھتے ہیں۔

ایک مسلمان لڑکی سے اس کی شادی بھی ہم نے خود کرائی ہے۔ دونوں خوشی خوشی ہمارے گھر میں رہ رہے ہیں۔

انسان عام طور پر فطرت کی سطح پر جیتے ہیں۔ اور فطرت کی سطح پر ہمیشہ ایک دوسرے کے درمیان اچھے تعلقات ہی ہوتے ہیں۔ مگر ہمارے لیڈر جھوٹے اشولے کر لوگوں کی سوچ بگاڑ دیتے ہیں اور یہیں سے فساد کا آغاز ہو جاتا ہے۔ یہ نااہل لیڈر فطرت کے نظام کو بگاڑنے کا کام کر رہے ہیں۔ یہ وہی چیز ہے جس سے قرآن میں ان الفاظ میں منع کیا گیا ہے: لا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحها۔

آکولہ میں ۶ دسمبر کے بعد کچھ فسادات ہوئے اور جان و مال کا نقصان بھی ہوا۔ مسٹر رویندر کمار نے بتایا کہ یہاں مسلمانوں کی ایک درگاہ ہے۔ ۶ دسمبر کی صبح کو کچھ ہندوؤں نے درگاہ پر دھاوا کر دیا۔ اور اس کی عمارت کو نقصان پہنچایا۔ مگر اس کے بعد خود ہندوؤں نے اس پر افسوس ظاہر کیا۔ اسی دن شام کو بہت سے ہندو درگاہ پہنچے۔ انھوں نے اس کی مرمت اور تعمیر شروع کر دی۔ وہ لوگ ساری رات کام کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ۸ دسمبر کی صبح طلوع ہوئی تو درگاہ دوبارہ بن کر تیار ہو چکی تھی۔

اس واقعہ کو سن کر میں نے کہا کہ درگاہ کی دوبارہ تعمیر حقیقۃً فطرت انسانی کا کارنامہ تھا۔ انسان کی فطرت میں شرمندگی (repentance) کا نہایت گہرا جذبہ ہے۔ انسان غلطی کرنے کے بعد ہمیشہ پچھتاوے میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اگر فریق ثانی دوبارہ غلطی کر کے انسانی فطرت کے عمل کو روک نہ دے تو یہ فطرت ضرور کام کرے گی ـــــ تخریب کے بعد خود شرمندہ ہو کر دوبارہ تعمیر کے کام میں لگ جائے گی۔

شانتی یاترا کے دوران ۲۰ دسمبر ۱۹۹۲ کو ہم لوگ امراوتی پہنچے تھے۔ حسب معمول سڑکوں پر پدیاترا کے بعد ہم ایک مقام پر ٹھہرے۔ یہاں ایک بڑا مجمع اکٹھا ہو گیا تھا۔ اچاریہ منی سوشیل کمار اور سوامی چیدانند نے اپنی تقریریں میں لوگوں سے شانتی قائم رکھنے کی اپیل کی۔

میں کھڑا ہوا تو سفر کے دوران نفرت کا ماحول اور فساد کے مناظر دیکھنے کی وجہ سے میری کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ پڑے۔ تقریر شروع کی تو میری زبان پر یہ الفاظ جاری ہو گئے: شانتی یاترا کس لئے نکلی ہے۔ یہ شانتی یاترا اس لئے نکلی ہے کہ جس آگ کو فائر بریگیڈ

کا پانی نہ بجھا سکا، اس کو سنت اور فقیر کے آنسوؤں سے بجھا دیا جائے۔

عجیب بات ہے کہ شانتی یاترا سے واپسی کے بعد ۲۹ دسمبر کا اخبار آیا تو اس میں یہی بات پرائم منسٹر نرسمہا راؤ کے حوالے سے چھپی ہوئی تھی۔ سوامی ویویکانند نے ۱۸۹۳ میں شکاگو کی کانفرنس میں ایک خطبہ دیا تھا۔ اس کے سو سالہ جشن کے طور پر کنیا کماری میں راشٹر چیتنا (قومی بیداری) کی تقریب منائی گئی۔ اس موقع پر پرائم منسٹر نرسمہا راؤ نے شرکت کی۔ انھوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

دیش آج بحران سے دوچار ہے۔ اس بحران کی گھڑی میں ہم کو روحانی اور مذہبی پیشواؤں کی مدد کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ وہ سیاست دانوں کے مقابلہ میں عوام کے جذبات کو زیادہ سمجھ سکتے ہیں۔ اگر ایسا ہو تو یہ ملک رہنے کی زیادہ بہتر جگہ ہو جائے گا۔ مجھے اس حقیقی راستہ کی تلاش ہے جس پر آئندہ اس ملک کو چلنا چاہئے۔ ٹائمس آف انڈیا (۲۹ دسمبر ۱۹۹۲) کی رپورٹ کے مطابق انھوں نے کہا کہ وزیر اعظم کی حیثیت سے وہ ایک ایسے پیاسے مسافر کی طرح ہیں جو پانی کی تلاش میں ہے۔ مگر افسوس کہ پانی کے بجائے میں ایک سراب میں جا پڑا:

He was like a thirsty traveller looking for water. But instead of water, I stepped into a mirage (p. 4).

ایک جگہ مجھے معلوم ہوا کہ جلوس پر فساد ہوا۔ کچھ مسلمانوں نے ایک جلوس نکالا۔ دوسرے فرقہ کے لوگوں نے روک ٹوک کی۔ اب دونوں طرف کے لوگ مشتعل ہو گئے۔ اس کے بعد وہ سب کچھ ہوا جو عام طور پر فرقہ وارانہ فسادات میں ہوتا ہے۔

میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ انڈیا میں سب سے بڑی بدعت جلوس ہے۔ موجودہ مزاج کے ساتھ جلوس نکالنا سرے سے جائز ہی نہیں۔ بالفرض اگر جلوس کو جائز سمجھا جائے تو وہ ان لوگوں کے لئے جائز ہوگا جو یہ صلاحیت رکھتے ہوں کہ وہ اشتعال کے باوجود مشتعل نہ ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ جمہوریت میں مظاہرہ کا حق ہے اور جلوس دراصل مظاہرہ کے لئے نکالا جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ برداشت والے لوگ اگر جلوس نکالیں تو اس کا نام مظاہرہ ہے، اور بے برداشت لوگ اگر جلوس نکالیں تو اس کا نام فساد۔ اور فساد کسی بھی قانونی نظام میں جائز نہیں۔

ایک صاحب نے پوچھا کہ الرسالہ مشن کیا ہے۔ میں نے کہا کہ الرسالہ مشن احیاء دین کا مشن ہے۔ الرسالہ کا مشن امت کو قرآن وسنت کی طرف بلانا ہے۔ الرسالہ کا مشن وہی ہے جو ہر دور میں مصلحین امت کا مشن رہا ہے۔ ایک مشہور دینی حلقہ کی طرف سے ایک عربی ماہنامہ نکلتا ہے۔ اس کے ٹائٹل کے صفحہ پر لکھا ہوا ہوتا ہے: شعارنا التوحید الی الاسلام من جدید۔ ایک اور بڑے دینی حلقہ کی طرف دوسرا عربی ماہنامہ شائع ہوتا ہے۔ اس کے پہلے صفحہ پر یہ فقرہ درج ہوتا ہے۔ ـــــ دعوتنا: عودۃ بالامۃ الی الکتاب والسنۃ۔

تمام دینی حلقے اور تمام اسلامی جماعتیں اس قسم کے الفاظ میں اپنا مقصد ظاہر کرتی ہیں۔ الرسالہ مشن کے سامنے بھی عین یہی نشانہ ہے۔ ہمارے اور دوسروں کے درمیان جو فرق ہے وہ اصول کا نہیں طریقہ کا ہے۔ اہل سنت والجماعت کے یہاں جو دین مسلم ہے وہی ہمارا دین بھی ہے۔ البتہ اس کو پیش کرنے کے لئے ہم نے عصری اسلوب اختیار کیا ہے۔

۶ دسمبر کے بعد ہونے والے بمبئی کے فساد میں دو سو آدمی ہلاک ہو گئے۔ یہ سب کے سب سلم علاقے میں رہنے والے لوگ تھے۔ میں نے ایک صاحب سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ بمبئی کے سلم علاقوں میں فساد ہوا، مگر یہاں کی کالونیوں میں فساد نہیں ہوا۔

انھوں نے جواب دیا کہ ایک سادہ سی مثال سے آپ اس کی وجہ سمجھ سکتے ہیں۔ یہ مکان جس میں آپ ٹھہرے ہوئے ہیں، اس میں ہر کمرہ کے ساتھ الگ الگ ٹائلیٹ موجود ہے، لیکن اگر آپ سلم علاقہ میں جائیں تو آپ پائیں گے کہ وہاں ایک سو آدمی پر ایک ٹائلیٹ کا اوسط ہے۔ ہر ٹائلیٹ پر آدمیوں کی لمبی لائن لگی ہوئی ہے۔ فساد کی سب سے بڑی وجہ اسی قسم کی بھیڑ ہے۔

میں نے کہا کہ مجھے آپ کی اس بات سے اتفاق ہے۔ اگر لوگوں میں تعلیم بڑھ جائے اور لوگوں کی معاشی حالت بہتر ہو جائے تو اس قسم کے لڑائی جھگڑے اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔

یہ پورا سفر اتنے بندھے ہوئے پروگرام کے تحت ہوا کہ مشکل سے کہیں اس کا موقع ملا کہ کسی جگہ ٹھہر کر اخبار پڑھا جائے۔ چنانچہ اخبارات زیادہ تر سفر کے دوران گاڑی میں پڑھے گئے۔ بمبئی کے ٹائمس آف انڈیا (۲۲ دسمبر ۱۹۹۲) میں صفحہ ۸ کی ایک خبر کی سرخی یہ تھی:

Tirupati temple's income on the rise

خبر میں بتایا گیا تھا کہ آندھرا پردیش کی تروملا پہاڑیوں میں واقع وینکٹیشور کے مندر میں اس کے عقیدت مندوں کی طرف سے حاصل ہونے والی رقم میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔ ۱۹۲۰ میں اس مندر میں ایک سال کے اندر ۱۰ لاکھ روپے وصول ہوئے۔ مئی ۱۹۹۲ میں صرف ایک گم نام عقیدت مند نے ۲۷ لاکھ روپے لاکر مندر کے بکس میں ڈال دیے۔

زائرین کی تعداد اتنی زیادہ بڑھ گئی ہے کہ ۱۹۹۱ میں صرف ایک دن میں پچاس ہزار آدمیوں نے آکر مورتی کے سامنے ماتھا ٹیکا۔ یہاں آنے والے زائرین جو بال کٹواتے ہیں وہ خود اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ ۹۲-۱۹۹۱ کے درمیان جمع ہونے والے بال کی مقدار دو لاکھ کیلو گرام سے زیادہ تھی۔ اور ان کو بیچ کر مندر کے ٹرسٹ کو ۱۸ ملین روپیہ حاصل ہوا۔ ریلوے کی طرف سے ۳۷ کنکٹنگ ٹرینیں تروپتی کے لئے چلائی گئی ہیں۔ اور اب مندر میں آنے والوں کا اوسط روزانہ ۶۰ سے ۷۰ ہزار تک ہوتا ہے۔

یہ تمام تر برکتی مذہب کا کرشمہ ہے جو ہر مذہب میں اور ہر مقام پر جاری ہے، اور اسی طرح خود مسلمانوں میں بھی۔ ہر مذہبی بھیڑ برکتی مذہب کی بھیڑ ہوتی ہے۔

ہماری پارٹی کے ایک فرد جسٹس چندر شیکھر دھرمادھیکاری (ریٹائرڈ) بھی تھے۔ انھوں نے اپنی ایک تقریر میں یہ واقعہ بتایا کہ آزادی سے پہلے ۱۹۲۰ کے لگ بھگ زمانہ کا واقعہ ہے۔ لاہور کے ایک جلسہ میں ایک مسلمان بیرسٹر مسٹر عالم تقریر کر رہے تھے۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے سوال کیا کہ بیرسٹر صاحب، آپ پہلے مسلمان ہیں یا پہلے ہندستانی ہیں۔ بیرسٹر صاحب نے جواب دیا کہ میرے بھائی آپ نے سوال صحیح نہیں کیا۔ آپ کو ابھی سوال کرنے کا طریقہ سیکھنا چاہئے۔ یہ سوال تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی مجھ سے پوچھے کہ آپ پہلے اپنی ماں کے ہو یا پہلے اپنے باپ کے ہو۔ انھوں نے کہا کہ آدمی بیک وقت اپنے باپ کا بھی ہوتا ہے اور اپنی ماں کا بھی۔ اسی طرح میں بیک وقت مسلمان بھی ہوں اور اسی وقت ہندستانی بھی۔

جسٹس چندر شیکھر نے یہ تقریر ۲۱ دسمبر کو ناگپور میں اہنسا بھون کے جلسہ میں کی۔ اس کو سن کر میں نے کہا کہ اس سوال کا سب سے زیادہ فطری جواب یہی ہے۔ ہمارے بعض لیڈروں کا یہ کہنا کہ "میں پہلے مسلمان ہوں اور اس کے بعد ہندستانی ہوں" بلاشبہ ایک لغو بات ہے۔ اس کا تعلق نہ

اسلام سے ہے اور نہ عقل سے۔

یہ امن کارواں کئی گاڑیوں پر مشتمل تھا۔ ایک گاڑی میں اچاریہ منی سوشیل کمار، سوامی چیدانند اور میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس گاڑی کا ڈرائیور ایک مسلمان تھا۔

منتظمین نے گاڑی کے اندر پھل، میوے، چائے وغیرہ کافی مقدار میں رکھ دیا تھا۔ راستہ میں جب بھی کوئی کھانے کی چیز نکالی جاتی تو میں نے دیکھا کہ سوامی چیدانند جی اصرار کے ساتھ مسلمان ڈرائیور کو اس میں شریک کرتے۔ پورے راستہ میں وہ اسی طرح ڈرائیور کے ساتھ بالکل برابری کا سلوک کرتے رہے۔

ایک بار ایسا ہوا کہ ڈرائیور صاحب غلط راستہ پر مڑ گئے۔ کافی آگے جانے کے بعد معلوم ہوا کہ ہم غلط راستے پر آگئے ہیں۔ پھر گھوم کر صحیح سڑک پر آئے۔ اس کی وجہ سے ہم لوگ منزل پر پہنچنے میں ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ ہو گئے اور پروگرام بھی گڑبڑ ہو گیا۔

اس وقت سوامی چیدانند جی نے نہایت تاکید کے ساتھ ہم لوگوں سے کہا کہ منزل پر پہنچ کر کوئی بھی شخص یہ لفظ منھ سے نہ نکالے کہ ہم لوگ تو صحیح وقت پر روانہ ہوئے تھے مگر ڈرائیور صاحب کی غلطی سے دیر ہو گئی۔ اس کی ذمہ داری ہم لوگ اپنے اوپر لیں۔ ڈرائیور پر ہرگز اس کی ذمہ داری نہ ڈالیں۔ چنانچہ یہی کیا گیا اور ڈرائیور صاحب باز پرس سے بچ گئے۔

۲۱ دسمبر کو واردھا پہنچے۔ واردھا کا لفظ پہلی بار تقسیم ہند سے پہلے اس وقت میرے علم میں آیا جب کہ ظفر علی خاں نے مولانا ابوالکلام آزاد پر طنز کرتے ہوئے یہ شعر لکھا تھا:

آئیں ابوالکلام جو وردھا سے گھوم کر

تحریک آزادی میں واردھا کی بڑی اہمیت رہی ہے۔ کیوں کہ یہاں مہاتما گاندھی نے ایک بستی بسائی تھی جو سیوا گرام آشرم کے نام سے مشہور ہوئی۔ مہاتما گاندھی کے بعد ان کے شاگرد ونوبا بھاوے ایک عرصہ تک یہاں مقیم رہے۔ دیکھنے سے پہلے واردھا کے بارے میں ایک افسانوی تصور میرے ذہن میں تھا۔ مگر جب شانتی یاترا کے ساتھ میں اس کی سڑکوں سے گزرا تو وہ مجھے عام شہروں جیسا ایک شہر نظر آیا۔

یہاں سے ہم لوگ سیوا گرام پہنچے۔ مہاتما گاندھی نے اپریل ۱۹۳۶ میں اس کو واردھا شہر کے

کنارے قائم کیا تھا۔ یہ ایک پرسکون مقام ہے جہاں کھلے میدانوں اور ہرے درختوں کے درمیان جگہ جگہ جھونپڑے (huts) بنے ہوئے ہیں۔ اسی میں سے ایک گاندھی جی کا جھونپڑا ہے جو صرف لکڑی اور مٹی کا بنا ہوا ہے۔ تمام جھونپڑوں کے اوپر منگلور ٹائل لگے ہوئے ہیں۔

مہاتما گاندھی کے جھونپڑے کو "باپو کٹی" کہا جاتا ہے۔ وہ انتہائی سادہ تھا۔ جنوری ۱۹۷۸ میں میکسیکو کے آلوان ایلچ (Ivan Illich) یہاں آئے تھے۔ وہ باپو کٹی کی سادگی سے اتنا متاثر ہوئے کہ وہ روزانہ دیر دیر تک یہاں دھیان لگا کر بیٹھے رہتے تھے تاکہ اس سے روحانی فیض حاصل کریں۔ برٹش گورنمنٹ نے بطور خود یہاں ٹیلی فون لگوایا تھا تاکہ برطانی ذمہ دار مہاتما گاندھی سے بات کر سکیں۔

گاندھی جی کے ایک شاگرد مسٹر گنیش دتہ گادرے (۷۲ سال) نے بتایا کہ گاندھی جی کی اس غریبی پر امیرانہ خرچ کرنا پڑتا تھا۔ مسٹر گادرے کے بیان کے مطابق، مسز سروجنی نائیڈو (۱۹۴۹-۱۸۷۹) نے تقسیم سے پہلے ایک بار کہا تھا کہ گاندھی کی غریبی کو باقی رکھنے کے لئے برلا کو دو ہزار روپیہ روزانہ خرچ کرنا پڑتا ہے:

It takes Birla two thousand rupees per day to keep Gandhi poor.

واضح ہو کہ یہ پچاس برس پہلے کی بات ہے۔ اس وقت دو ہزار روپیہ روزانہ آج کے لحاظ سے ۲۰ ہزار روپیہ روزانہ سے بھی زیادہ تھا۔

۲۱ دسمبر کو سیوا گرام کی ایک نشست میں میں نے کہا کہ یہاں کا پورا ماحول سکون اور شانتی کا ماحول ہے، ہم چاہتے ہیں کہ سکون اور شانتی کا یہی ماحول پورے ملک میں عام ہو جائے۔ میں نے کہا کہ مہاتما گاندھی نے آزادی کی تحریک میں عوام کو نان وائلنس (اہنسا) کی بنیاد پر موبیلائز کیا تھا۔ ہم تعمیر ملک کی تحریک کو دوبارہ نان وائلنس کی بنیاد پر موبیلائز کرنا چاہتے ہیں۔ ۱۹۴۸ میں جہاں مہاتما گاندھی کا مشن ختم ہوا تھا، وہیں سے دوبارہ ہمیں اپنے عمل کا آغاز کرنا ہے۔

شانتی یاترا میں میرے ساتھ ایک بڑے ہندو گرو بھی تھے۔ میں نے دیکھا کہ ہر جگہ لوگ ان کے ساتھ غیر معمولی عقیدت کا اظہار کر رہے ہیں۔ اور ان سے آشیرواد (برکت) لے رہے ہیں۔ میں نے غور کیا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ اپنے ہی جیسے ایک انسان کو لوگ اتنا زیادہ عظمت

دینے لگتے ہیں۔ یہی چیز خود مسلمانوں میں بھی "اکابر" کی صورت میں پائی جاتی ہے۔ غور کرنے کے بعد سمجھ میں آیا کہ یہ درحقیقت انسانی فطرت میں چھپے ہوئے جذبۂ عبودیت کا غلط استعمال ہے۔ عبودیت کا جذبہ ہر انسان میں نہایت طاقت ور صورت میں موجود ہے۔ وہ اس لئے تھا کہ خدا کو اس کا مرجع بنایا جائے۔ مگر نادان لوگ خود ساختہ اکابر کو اس کا مرجع بنا لیتے ہیں۔

جو لوگ انسانی اکابر کو اپنے جذبۂ عبودیت کا مرکز بناتے ہیں، ان سے آپ ملیں تو وہ ہمیشہ سکون اور آنند کی بات کریں گے۔ جب کہ اصحاب رسول کے یہاں ہم پاتے ہیں کہ ان کے ایمان باللہ نے ان کو بے چینی کی کیفیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی اکابر کے یہاں احتساب (accountability) کا کوئی تصور نہیں ہوتا، جب کہ خدا کے یہاں احتساب کا تصور شدت کے ساتھ موجود ہوتا ہے۔ عبودیت، احتساب کے بغیر آنند ہی آنند ہے، اور عبودیت، احتساب کے ساتھ درد ہی درد۔

ایک تعلیم یافتہ ہندو تاجر نے کہا کہ مسلمانوں میں ایک کمزوری ہے، اور وہی ان کی ساری مصیبتوں کا اصل سبب ہے۔ مسلمان بہت آسانی سے کسی شوشہ کی بات پر بپھر جاتے ہیں۔ جو لوگ چاہتے کہ مسلمان ترقی نہ کریں وہ مسلمانوں کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایک کے بعد ایک ان کو شوشوں میں الجھائے رہتے ہیں۔ مسلمانوں کی طاقت جو اپنی ترقی میں لگنا چاہئے وہ دوسروں سے لڑنے میں ضائع ہو جاتی ہے۔ اس کا حل صرف ایک ہے ـــــ مسلمانوں کو اتنا زیادہ باشعور بنا دیا جائے کہ لوگ اشتعال انگیزی کریں تب بھی وہ مشتعل نہ ہوں۔ یہاں اشتعال انگیزی کو ختم کرنا ممکن نہیں۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ مشتعل ہونے والے لوگ مشتعل ہونا چھوڑ دیں۔

۲۱ دسمبر کی شام کو ہم ناگپور میں داخل ہوئے۔ سڑکوں پر چلتے ہوئے ایک جگہ دیکھا کہ ایک بینر لگا ہوا ہے۔ اس پر ہندی میں یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:

رام للا ہم آئیں گے مندر وہیں بنائیں گے۔

دہلی کے مسلم محلہ میں اسی قسم کا نعرہ میں نے برعکس صورت میں دیکھا تھا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ سڑک کے درمیان کالا کپڑا لٹکا ہوا ہے۔ اس پر یہ لکھا ہوا تھا:

مورتیوں کو ہٹاؤ مسجد وہیں بناؤ

ایک آدمی پہلے نعرہ کو دیکھ ہندو کو برا کہے گا اور دوسرے نعرہ کو دیکھ کر مسلمان کو۔ مگر میں کہونگا کہ یہ نعرے ہندوؤں یا مسلمانوں کے نعرے نہیں ہیں۔ یہ نعرے صرف کچھ جاہلوں کے نعرے ہیں۔ ہمارے دیش میں ابھی تک ۷۰ فی صد آدمی جاہل ہیں۔ یہی جہالت تمام جھگڑوں کی اصل جڑ ہے۔ اگر اس ملک سے جہالت کو ختم کر دیا جائے تو اس کے بعد تمام بے فائدہ جھگڑے اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔ جو آدمی بھی ملک میں ترقی چاہتا ہو اس کو چاہئے کہ تعلیم کے کام میں اپنے آپ کو لگا دے۔

ناگپور کو آر ایس ایس کا گڑھ سمجھا جاتا ہے۔ یہاں کی تقریر میں میں نے خاص طور پر یہ بات کہی کہ مسائل کا حل ٹکراؤ نہیں ہے بلکہ تدبیر ہے۔

ناگپور میں جناب عبدالسلام صاحب اور جناب حنیف صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یہ لوگ اپنے تجارتی مشاغل کے ساتھ دین کا کام بھی کرتے رہتے ہیں۔

عبدالسلام صاحب نے آکاش بلڈنگ کے نام سے ایک عمارت بنائی ہے۔ اس میں آٹھ اپارٹمنٹ ہیں۔ اور نیچے کے حصہ میں چار دکانیں ہیں۔ گراؤنڈ فلور پر انھوں نے ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد بنائی ہے۔ عمارت اور دکان کے افراد یہاں جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں۔ اس کے اندر تقریباً چالیس آدمی نماز پڑھ سکتے ہیں۔ واچ مین کے ذمہ یہ کام ہے کہ وہ وقت پر اذان دیدے۔ فجر کے وقت وہ ہر فلیٹ پر آکر گھنٹی بجا دیتا ہے۔ اس طرح اس بلڈنگ میں نماز باجماعت کا نظام قائم ہے۔ یہ ایک اچھا نمونہ ہے جو قابل تقلید ہے۔

بھارتیہ جنتا پارٹی کے ایک سرگرم ممبر سے گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ آپ لوگوں نے رام مندر کے نام پر جو آندولن چلایا اور ۶ دسمبر کو اس کا جو نتیجہ نکلا، اس کو سامنے رکھ کر آپ سوچیں تو آپ مانیں گے کہ اس معاملہ میں آپ کے لئے چوائس مندر اور مسجد کے درمیان نہیں تھا، بلکہ مسجد اور انارکی کے درمیان تھا۔ کیوں کہ مسجد کو ڈھا کر جو چیز آپ نے پائی ہے وہ حقیقۃً مندر نہیں ہے بلکہ انارکی ہے جس نے پورے دیش کے مستقبل کو خطرہ میں ڈال دیا ہے۔

میں نے کہا کہ اگر آپ لوگوں کو دیش سے محبت ہے تو آپ لوگوں کو وہی کرنا چاہئے جو ۱۹۲۲ء میں مہاتما گاندھی نے کیا تھا۔ انھوں نے اہنسا کی بنیاد پر نان کوآپریشن کی تحریک چلائی۔ مگر جب چوراچوری کے مقام پر کانگرسی کارکنوں نے تشدد کا واقعہ کیا تو انھوں نے فوراً ہی اپنی تحریک روک دی اور اس

کو ہمالیائی غلط اندازہ (Himalayan miscalculation) قرار دیا۔ آپ لوگوں کے لئے صرف افسوس کا اظہار کافی نہیں۔ آپ کو چاہئے کہ اپنی تحریک کو مکمل طور پر روک دینے کا اعلان کریں۔ اس سے کم درجہ کی کوئی بھی چیز آپ کے لئے کافی نہیں ہو سکتی۔

ناگپور میں شانتی یاترا ختم ہو گئی۔ اب ہمیں ناگپور سے دہلی واپس جانا تھا۔ مگر پائلٹوں کی ہڑتال کی وجہ سے تمام ملک میں پروازیں معطل ہو رہی ہیں۔ صرف ٹرنک روٹ پر مشکل سے پروازوں کا سلسلہ باقی رکھا جا سکا ہے۔ اس لئے ہم لوگوں نے طے کیا کہ ناگپور سے بمبئی جائیں۔ اور بمبئی سے دہلی کے لئے ہوائی جہاز پکڑیں۔

ناگپور سے دہلی پہنچنے کے لئے ہمیں صرف ۹۵۰ کیلو میٹر کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ مگر ناگپور سے بمبئی اور پھر بمبئی سے دہلی کا راستہ اختیار کرنے کی وجہ سے ہماری منزل ۲۲۷۱ کیلو میٹر لمبی ہو گئی۔ "قریب" جب قابل عمل نہ ہو تو "دور" ہی زیادہ قریب بن جاتا ہے۔

۲۲ دسمبر کو ہم لوگ انڈین ایرلائنز کی فلائٹ ۱۴۷ کے ذریعہ ناگپور سے بمبئی پہنچے۔ یہاں قیام کرنے کے بعد ۲۳ دسمبر ۱۹۹۲ کو انڈین ایرلائنز کی فلائٹ ۱۸۳ کے ذریعہ دہلی واپس ہوئی۔ دہلی پہنچنے کے بعد بظاہر شانتی یاترا ختم ہو گئی۔ مگر میں نے سوچا کہ اصل کام تو اب شروع کرنا ہے۔ یعنی شانتی یاترا کے تجربہ کو مزید آگے بڑھانا ہے۔ چنانچہ مسٹر شانتی لال موتھا نے کہا کہ ہم اس شانتی اندولن کو پورے دیش میں چلائیں گے۔

بمبئی کے ٹائمس آف انڈیا (۲۲ دسمبر) کے درمیانی صفحہ پر دو مضمون چھپے ہوئے تھے۔ ایک امولیا گنگولی کا تھا۔ اس مضمون میں ملک کے لوگوں کی غیر سنجیدہ سوچ کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر اٹل بہاری باجپئی کا یہ تبصرہ نقل کیا گیا تھا کہ ہوش وحواس کی بات کون سنتا ہے:

Who's going to listen to the voice of sanity.

انھوں نے ملک کی تاریک صورت حال کا نقشہ کھینچتے ہوئے بتایا تھا کہ اگر یہی حالت باقی رہی تو اجودھیا کے واقعہ کے بعد انڈیا اعتباری بحران (credibility crisis) میں مبتلا ہو جائے گا۔ انڈیا دوسرا لبنان یا دوسرا یوگوسلاویہ بن جائے گا۔

میں نے ایک صاحب سے کہا کہ مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ میں نے کہا کہ عربی کا ایک مثل ہے

کہ تعرف الاشیاء باضدادھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تقابل کے ذریعہ باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔ آپ یوں دیکھئے کہ ۶ دسمبر کو بابری مسجد ڈھادی گئی۔ مگر مسلمانوں نے مقابلۃً بہت ہی کم ردعمل کا مظاہرہ کیا۔ پھر ایک بابری مسجد کے انتقام میں پاکستان میں ۶۰ مندر ڈھائے گئے۔ گویا ایک کے بدلے میں ساٹھ۔ اس تناسب سے انڈیا کے ہندوؤں کو ۳۶۰۰ مسجدیں گرانا چاہئے تھا۔ پاکستانیوں نے بلڈوزر کے ذریعہ مندروں کو گرایا تو انڈیا میں ڈائنامائٹ کے ذریعہ مسجدوں کو ڈھانا چاہئے تھا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔

اس تقابل میں امید کا پہلو ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انڈیا کے لوگوں کا جذباتی ابال ایک حد کے اندر رہتا ہے۔ وہ دوسروں کی طرح تناسب سے متجاوز نہیں ہو جاتا۔ یہ برداشت کی علامت ہے، اور برداشت بلاشبہ سب سے بڑی چیز ہے۔

۲۳ دسمبر کا دن بمبئی میں گزارا۔ کئی لوگوں سے ملاقات اور گفتگو ہوئی۔ کچھ اخبارات پڑھے۔ ایک قابل ذکر ملاقات مسٹر راجندر سدرشن جین (۷۳ سال) سے تھی۔ ۹ سال کی عمر میں ہولی کے پٹاخے نے ان کی ایک آنکھ کو نقصان پہنچایا۔ اس کا آپریشن کرایا تو سرجن کی غلطی سے دونوں آنکھ جاتی رہی۔ اب وہ مکمل طور پر نابینا ہیں۔

میں نے دیکھا کہ وہ بے تکلفی کے ساتھ اسی طرح ٹیلی فون نمبر ملا رہے ہیں جیسے کوئی آنکھوں والا ٹیلی فون نمبر ڈائل کرتا ہے۔ مزید معلوم ہوا کہ ان کا ایک بڑا بزنس ہے۔ پورا بزنس وہ خود کنٹرول کرتے ہیں۔ حتی کہ بیرونی ملکوں میں تجارتی سفر کرتے ہیں اور بڑے بڑے تجارتی معاملات طے کرتے ہیں۔

میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ کے اندر وہ چیز ہے جس کو چھٹی حس کہا جاتا ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ چھٹی سنس کوئی مسٹیریس چیز نہیں۔ جب آپ کے اندر سے کوئی سنس چلا جاتا ہے تو نیچر اس کی تلافی کرتی ہے اور آپ کے اندر اپنے آپ ایک اور سنس پیدا ہو جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مجھے دیکھے بغیر ہر چیز کا اندازہ ہو جاتا ہے، اور وہ اکثر درست ہوتا ہے۔

"تلافی" کا یہ اصول قدرت کے پورے نظام میں ہے۔ جب بھی آپ کوئی چیز کھوئیں تو پیشگی طور پر یقین کر لیجئے کہ کھونے کے ساتھ وہیں ایسے اسباب پیدا ہو چکے ہوں گے جو آپ کی محرومی کی تلافی کر سکیں۔ ہر محرومی اپنے ساتھ یافت کا سامان لئے ہوئے ہے۔

سوامی چید انند رشی کیش کے سب سے بڑے آشرم کے چیرمین ہیں۔ ان کا مشن یورپ، امریکہ،

آسٹریلیا، ہر جگہ پھیلا ہوا ہے۔ وہ سال بھر عالمی سفر پر رہتے ہیں۔

واپسی کے بعد رشی کیش سے سوامی جی کا ٹیلی فون آیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم ہندو دھرم اور جین دھرم پر کتابیں تیار کرا رہے ہیں۔ ان کے نام Hinduism and daily life اور Jainism and daily life ہوں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ بھی ہمیں اسلام کے موضوع پر ایک کتاب لکھ کر دیں جو Islam and daily life کے موضوع پر ہو۔ یہ کتاب تقریباً تین سو صفحہ تک ہو سکتی ہے۔ ہم ان کتابوں کو دنیا کی دس زبانوں میں چھاپ کر سارے ملکوں میں پھیلائیں گے۔

شانتی یاترا میں جب میں نکلا تو شروع میں میں نے اسلام کا نام لئے بغیر اخلاقیات کی زبان میں تقریر کی۔ مگر اسی دوران نجی مجلسوں میں اکثر میں قرآن و حدیث کی باتیں لوگوں کو سنایا کرتا تھا۔ سوامی چید انند نے ایک دو تقریر سننے کے بعد کہا: مولانا صاحب، آپ ہم لوگوں کو قرآن و حدیث کی جو باتیں بتاتے ہیں وہی آپ جلسہ میں بھی کہئے۔ وہ ہم کو بہت اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد کی تقریروں میں قرآن و سنت کے حوالے سے میں اپنی بات کہنے لگا۔

شانتی یاترا سے پہلے نہ میں سوامی چید انند کو جانتا تھا اور نہ وہ مجھ کو۔ دونوں ایک دوسرے کے نام سے بھی واقف نہ تھے۔ مگر دو ہفتہ کے ساتھ کا یہ نتیجہ ہوا کہ اب وہ الرسالہ کے قاری بن گئے ہیں۔ اور وہ مجھ سے اسلام کے موضوع پر تین سو صفحہ کی کتاب لکھوانا چاہتے ہیں تاکہ اس کو چھاپ کر ساری دنیا میں پھیلائیں۔ دوری غلط فہمی پیدا کرتی ہے۔ اور قربت غلط فہمی کو ختم کر کے دو اجنبیوں کو ایک دوسرے کا دوست بنا دیتی ہے۔

۲۲ دسمبر ۱۹۹۲ کی رات کو بمبئی سے دہلی کے لئے واپسی ہوئی۔ انڈین ایئر لائنز کا جہاز کئی گھنٹہ لیٹ ہو کر بمبئی سے روانہ ہوا۔ ایک ہم سفر نے کہا کہ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے کہ لوگ پرائیویٹ کمپنیوں کے جہاز سے سفر کریں گے اور سرکاری انڈین ایئر لائنز کو مسافر ملنا مشکل ہو جائے گا۔ الا یہ کہ دوبارہ قانون کا سہارا لے کر لوگوں کو صرف سرکاری جہازوں میں سفر کرنے پر مجبور کر دیا جائے

آج میں اپنے امن مشن کا پہلا دور ختم کر کے دہلی واپس جا رہا تھا۔ میں نے سوچا کیا اس مشن میں مجھے کامیابی حاصل ہوگی۔ یہ سوچتے ہوئے مجھے امریکہ کے فادر ڈیوائن (۱۹۶۵-۱۸۷۷) کی یاد آئی۔ انھوں نے امریکہ میں اسی قسم کا ایک مشن شروع کیا تھا جس کو امن مشن

(Peace Mission) کہا جاتا ہے۔ اس مشن میں انھیں زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کامیابی کا راز کیا تھا، مبصرین کا خیال ہے کہ اس کا راز اہل شاگردوں کی جاں نثاری تھا۔ ان کو ایسے لائق شاگرد مل گئے تھے جو اس مشن (devotion of competent disciples) میں اپنے آپ کو وقف کر دیں۔

ایسے ہی افراد کسی مشن کا اصل سرمایہ ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مجھے ایسے ساتھی مہیا فرمائے۔ اگرچہ ہماری قوم میں آج سب سے زیادہ جو چیز نایاب ہے وہ بلاشبہ یہی ہے۔

سفر سے واپسی کے بعد ایک صاحب نے پوچھا کہ شانتی یاترا جیسے کام کی کیا کوئی شرعی بنیاد بھی ہے۔ میں نے کہا کہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ اسی قسم کا ایک کام ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں حلف الفضول کی صورت میں ملتا ہے۔ آپ کی بعثت سے قبل مکہ کے کچھ معزز افراد نے مل کر ایک انجمن بنائی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ سماجی بگاڑ کو روکا جائے۔ مظلوم کی فریاد رسی کی جائے۔ یہ اگرچہ بعثت نبوی سے قبل کا واقعہ ہے۔ مگر بعثت کے بعد آپ نے یہ فرما کر اس کی تصدیق کر دی کہ اگر اسلام میں بھی مجھے اس کی طرف بلایا جائے تو میں اس کو قبول کر لوں گا (لو دعیت الیہ فی الاسلام لاجبت)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سماجی انصاف اور مشترک اجتماعی مصالح کے تحفظ کی خاطر کثیر جماعتی تعاون کا طریقہ اسلام کے عین مطابق ہے۔ ایسے مشترک پروگرام میں شرکت کرنا ایک ایسا دینی تقاضا ہے جس کی اہمیت خود سنت نبوی کے ذریعہ ثابت ہوتی ہے۔

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اردو

تذکیر القرآن جلد اول	200/-
تذکیر القرآن جلد دوم	200/-
اللہ اکبر	45/-
پیغمبر انقلاب	40/-
مذہب اور جدید چیلنج	45/-
عظمتِ قرآن	30/-
عظمتِ اسلام	-
عظمتِ صحابہ	7/-
دین کامل	50/-
الاسلام	40/-
ظہورِ اسلام	40/-
اسلامی زندگی	25/-
احیاء اسلام	20/-
راز حیات	50/-
صراط مستقیم	40/-
خاتون اسلام	50/-
سوشلزم اور اسلام	40/-
اسلام اور عصر حاضر	30/-
الربانیہ	40/-
کاروان ملت	45/-
حقیقت حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دور جدید کا خالق	25/-
حدیث رسولؐ	-
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	85/-
میوات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	
راہ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	50/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-
اقوال حکمت	20/-
ڈائری جلد اول	-
ڈائری جلد دوم	-
سفرنامہ (ملکی اسفار)	-

انوار حکمت	-
تعمیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدید دین	20/-
عقلیات اسلام	30/-
مذہب اور سائنس	-
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	5/-
اسلام دین فطرت	7/-
تعمیر ملت	6/-
تاریخ کا سبق	7/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	5/-
تعارف اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	5/-
راہیں بند نہیں	7/-
ایمانی طاقت	7/-
اتحاد ملت	7/-
سبق آموز واقعات	7/-
زلزلہ قیامت	10/-
حقیقت کی تلاش	7/-
پیغمبر اسلام	5/-
آخری سفر	7/-
اسلامی دعوت	7/-
خدا اور انسان	7/-
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	5/-
دینی تعلیم	7/-
حیات طیبہ	7/-
باغ جنت	7/-
نار جہنم	7/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	7/-
شخصیات اسلام	-
تعدد ازدواج	3/-

روشن مستقبل	7/-
صوم رمضان	7/-
علم کلام	7/-
صداقت اسلام	-
علماء اور دور جدید	8/-
ہندستانی مسلمان	7/-
سیرت رسولؐ	-
ہندستان آزادی کے بعد	3/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	8/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی فکر	7/-
اسلام کا تعارف	4/-
ہندی	2/-
سچائی کی تلاش	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	6/-
پیغمبر اسلام	3/-
عربی	7/-
الاسلام یتجدی	85/-
الاسلام والعصر الحدیث	-
منزل کی اور	10/-

آڈیو کیسٹ

A-1 حقیقتِ ایمان	25/-
A-2 حقیقتِ نماز	25/-
A-3 حقیقتِ روزہ	25/-
A-4 حقیقتِ زکوٰۃ	25/-
A-5 حقیقتِ حج	25/-
A-6 سنتِ رسولؐ	25/-
A-7 میدانِ عمل	25/-
A-8 پیغمبرانہ رہنمائی	25/-
A-9 اسلامی دعوت کے جدید امکانات	25/-
A-10 اسلامی اخلاق	25/-
A-11 اتحادِ ملت	25/-
A-12 تعمیرِ ملت	25/-
A-13 نصیحت لقمان	25/-

A-14 متفرق سورتیں ۱	30/-
A-15 متفرق سورتیں ۲	30/-
A-16 متفرق سورتیں ۳	30/-

ویڈیو کیسٹ

V-1 پیغمبر انقلاب	200/-
V-2 اسلام داعی امن	200/-
V-3 اسلام دور جدید کا خالق	-
V-4 امت مسلمہ اور جدید چیلنج	-
V-5 اسلام اور سماجی انصاف	-
V-6 اسلام اور دور حاضر	-

God Arises	Rs 85/-
Muhammad	85/-
The Prophet of Revolution	
Islam As It is	40/-
God Oriented Life	60/-
Words of the Prophet	-
Indian Muslims (Hb)	145/-
Indian Muslims (Pb)	55/-
Introducing Islam	-
Religion and Science	30/-
Tabligh Movement	20/-
Islam the Voice of Human Nature	-
Islam the Creator of Modern Age	-
The Way of Find God	6/-
The Teachings of Islam	7/-
The Good Life	7/-
The Garden of Paradise	7/-
The Fire of Hell	7/-
Man Know Thyself!	4/-
Muhammad The Ideal Character	6/-
Polygamy and Islam	3/-
Words of Wisdom	-

فائل الرسالہ اردو (مجلد)

سال 1982	100/-
1985	100/-
1986	100/-
1987	100/-
1988	100/-
1989	100/-
1990	100/-
1991	100/-

فائل الرسالہ انگریزی (مجلد) 1991 تا 1984 100/- فی جلد

فائل الرسالہ ہندی (مجلد) 1990-91 100/-

AL-RISALA BOOK CENTRE
1, NIZAMUDDIN WEST MARKET, NEW DELHI 110 013 Tel 4697333, 611128, Fax 4631891